المنار

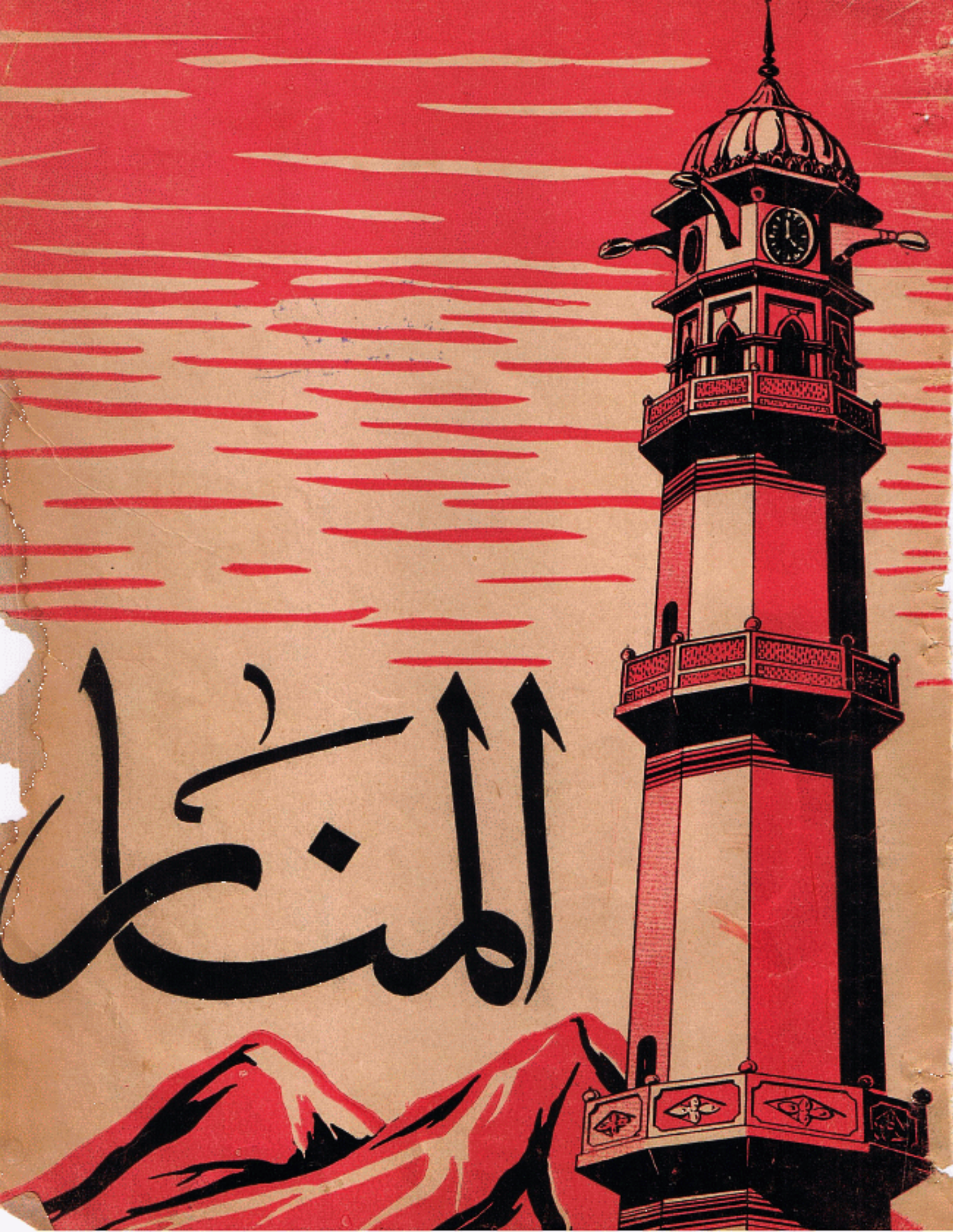

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج لاہور

جلد نمبر ۲

شمارہ نمبر

اکتوبر - دسمبر ۱۹۵۱ء

نگران
فیض الرحمٰن فیضی ایم اے

مدیران
اسلم باجوہ
نورالدین امجد

فہرس

بزم المنار ۲

خطاب بہ مسلم .. .. ذوالفقار علی خان گوہر ۳

اردو ہماری زبان ہے .. فیض الرحمٰن فیضی ایم اے ۵

سیکنڈ ایئر فولز .. .. میاں محمد یونس ۶

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق .. نورالدین امجد ۸

احساس .. .. سمیع اللہ قریشی ندیم تاثیر } ۱۰

غزل .. .. راحت ملک }

سیلانی کا سفرنامہ .. .. سیلانی ۱۱

دھوپ چھاؤں .. .. عبدالوحید سلیم ۱۳

حرف آخر ۱۵

پبلشر جنید ہاشمی نے انتشار پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

بزمِ المنار

(۱)

احمدیہ بلڈنگس لاہور۔ ۳؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء

محترمی فیضی صاحب!

خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت 'المنار' سے میرا قلمی تعلق غیر آئینی ہے۔ لیکن آپ مجھے آئین شکنی کی ترغیب دیتے گئے اور میں اس کا مرتکب ہوتا گیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جہاں میں نے 'المنار' کا نام تجویز کیا۔ وہاں 'المنار' نے میرے اندر سوئی ہوئی صلاحیت کو بیدار کیا۔ المنار کی بدولت مجھ پر ایک نئی راہ کھل گئی — ادب کی راہ۔ اور میرا ایمان ہے کہ ادب کی راہ زندگی کی راہ ہے۔

تو کیا میں 'المنار' کا محسن ہوں اور 'المنار' میرا محسن ہے؟ میرا یہ کہنا تعلّی سے کم نہیں۔ نام بے حقیقت بھی ہیں اور بے شمار بھی۔ 'المنار' المنار' کہلاتا تو کچھ اور کہلاتا۔ اور پھر بھی وہی کچھ ہوتا جو وہ اب ہے۔ لیکن شاید میں 'المنار' کے بغیر اردو کے چار فقرے لکھنے کے قابل نہ ہو سکتا۔ میں نے 'المنار' کو صرف نام دیا لیکن 'المنار' نے مجھے کام دیا۔

کیسے ممکن ہے کہ مجھے 'المنار' سے تعلق کا لحاظ نہ ہو؟ تعلق کا پاس میری طبیعت کا حصہ ہے۔ میری زندگی کا خاصہ ہے بلکہ میرے نزدیک تو زندگی نام ہی تعلق کے احساس کا ہے۔ یہ تعلق ترشۂ سنگ سے ہو یا برگِ گل سے، مُشتِ خاک سے ہو یا سیلِ نور سے۔ ایک شعر میں میں نے یہی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔

ترا خیال مرا دل یہی حقیقت ہے ؎ حیات ورنہ ہے اک اعتبارِ وہم و گمان

عملی دنیا کی طرف آئیے۔ زندگی میں کامیابی ناپنے کے کئی پیمانے ہیں — تکاثرِ اموال و اولاد بھی، زینت و تفاخر بھی لیکن میرا کامرانی جانچنے کا معیار یہ ہے کہ انسان خود سے پوچھے کہ اُس نے اپنی زندگی میں کتنے دلوں میں گھر کیا؟ کتنے دلوں کو دُکھایا؟ بہترین انسان وہ ہے جو درویشانہ آزادی اور قلندرانہ بے نیازی کے ساتھ زندگی کی راہ سے گزر جائے ؎

مَردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ ؎ ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم (اقبال)

اگر کسی طبع نے کسی بہتر حقیقت کو پایا ہے تو وہ اسے صاف صاف پیش کر دے۔ بے سبب کسی کے دل و دماغ اور دست و بازو سے نہ اُلجھے اور اس پر عرصۂ حیات تنگ نہ کر دے ؎ آدمیت احترامِ آدمی ؎ باخبر شو از مقامِ آدمی (اقبال)

شاید یہ خیال کیا جائے کہ یہ بظاہر تو آزادہ روی کا مشرب ہے لیکن بباطن ضعف و شکست کا مسلک ہے۔ لیکن نہیں ایسا نہیں۔ سیاسی نظریوں کی دہائی اور مادی ہوتی انسانیت کو اطمینان کا سانس اسی طرح نصیب ہو سکتا ہے کہ ادیب اپنی امن پسندی، صلح جوئی وسعتِ قلبی اور بالغ نظری کے ساتھ اسے سہارا دے —— ادب کی جنگ بہت کڑی ہے، ادیب کی راہ گریز اور فرار کی راہ نہیں انتہائی تگ و دَو اور جد و جہد کی راہ ہے۔ ادیب کا راستہ کٹھن ہے اور منزل دُور۔ لیکن اسے ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ براؤننگ نے کیا اچھا کہا ہے —" انسان کی رسائی اس کی گرفت سے آگے ہی رہے ورنہ جنت کا تخیل بے معنی ہے؟!

مشہور انگریزی نقاد آرنلڈ کو اپنے زمانے میں خدشہ تھا کہ علم و ادب کی شمع گل ہو گئی تو کور ذوق اور وحشی قومیں دنیا میں اندھیر مچا دینگی۔ بعینہٖ یہی خوف آج کے ادیب کو ہے۔ زمین رہزنوں اور قزاقوں کا تختۂ مشق بن چکی، انسانیت کا مستقبل تاریک ہو چکا۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے

میں اگر کوئی امید کی کرن نظر آتی ہے۔ تو وہ ادب کا وجود ہے۔ اور ادیب کی کوشش!

والسلام
مخلص، غلام علی چودھری

(میرے عزیز و محترم دوست چودھری صاحب نے مضمون کے بدلے مجھے خط لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خط بذاتِ خود ایک مضمون ہے۔ وقت کا اہم مسئلہ لیکن ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ ہمارا آج کا ادیب قال میں جتنا تو منداور چاق و چوبند ہے، حال میں اتنا ہی منکوس ہو کر رہ گیا ہے۔ فیضی)۔

(۲)

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

"بزمِ المنار" کی بڑھتی ہوئی دلچسپی، اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ میں نہایت ادب سے یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اس بزم کو محض خطوط تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ اسے عالمِ وجود میں لا کر باقاعدہ ہفتہ وار ورنہ کم از کم ماہانہ اجلاس منعقد کئے جائیں۔ جہاں ہم اور ہو سکے تو بیرونی حضرات مسائلِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات، تنقید کے لئے مضامین اور نظمیں پیش کیا کریں۔

نور الدین صاحب امجد کا خط جو سیلانی کا سفر نامہ کے متعلق شائع ہوا ہے، میرے لئے باعثِ حیرت ہے۔ امجد صاحب خود اُردو نویس اور مضمون نگار ہیں لیکن "سیلانی" کی زبان اُن کے پلّے نہیں پڑتی۔ جہاں تک زبان کا سوال ہے، تو یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ بہترین قسم کا لسانی تنوع جو اس سفرنامہ میں دیکھا جا رہا ہے، اُردو نثر نگاری میں اپنا ایک الگ اور نیا مقام رکھتا ہے۔ الفاظ کا محلِ استعمال، ان کی نوک پلک اور محاورات کے ساتھ ساتھ استعاروں اور تشبیہات کو قدرت کے ساتھ سمویا جاتا ہے۔ رہا اُس کا مصرف؟ تو میں ادب کے ساتھ کہوں گا کہ سفرنامہ کے افادی پہلو نمایاں اور واضح تر ہیں۔ ہاں اس کی تلمیحات اور کنائے واقعات کے عدمِ علم کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے میں استدعا کروں گا کہ حضرتِ سیلانی کو "بزمِ المنار" کا اجلاس طلب کر کے ہمارے سامنے لایا جائے، تاکہ ہم اس سلسلہ میں بھی اپنی تسکین کر لیں۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ زیارت بھی ہو جائے گی۔ میری نظر میں اُن کا حلیہ یہ ہے کہ وہ بہت ہی گھاگ اور پُرانے قسم کے کوئی ۳ سُوت موٹا چشمہ لگانے والے بڑے میاں ہیں۔ جن کا چشمہ بھی ڈوریوں سے کانوں میں بندھا ہوگا۔ چشمہ کے بوجھ سے ناک میں گڑھا پڑ چکا ہے۔ ڈوریوں کے کھچاؤ سے کان کھڑے ہو چکے ہیں۔ آنکھیں چیل جیسی تیز مگر اتنی اندر کو دھنسی ہوئی ہیں کہ لوگ انہیں ——— یوں سمجھئے کہ لائن صاف۔ ——— لنڈے بازار سے ملٹری فل بوٹ لا کر پہن رکھا ہوگا۔ سر پہ ایک بال باقی نہ ہوگا۔ اور قد کم سے کم ہماری نئی ڈبل ڈیکر (اومنی بس کی دو منزلہ بس) سے ½ یعنی ملک محمد علی آف سیکنڈ ایئر سے ڈیڑھ بالشت ۲ ½ انگل اونچے۔

آپ الیکشن کرا لیجئے۔ ہم سب ان کی زیارت اور ہمکلامی سے مشرف ہونا چاہتے ہیں۔

خطوط ضرور ہو گیا ہے۔ مگر ایک ضروری بات رہ جائے گی، یعنی مکرم نصیر احمد خاں صاحب کے مشورے اور قیمتی مشورے۔ میں تو یہاں تک عرض کر سکتا ہوں کہ ان مشوروں پر تمام رسائل کو عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن، کالج میگزین ———؟ یہ مسئلہ قابلِ غور ہے۔ معیاری مضامین، فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر تک کے طلبا، تعلیمی مصروفیات، اور پھر معیاری مضمون؟ یہ گتھی سلجھانے والے کے لئے ہم کوئی انعام مقرر کر دیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ والسلام

راحت ملک

خطاب بہ مسلم

اے مسلم سنجیدہ غیرت کا سبق لے تو
افسانۂ ماضی سے عبرت کا سبق لے تو

تنظیم کی قوت سے کمزور قوی دل بن
کمزوروں سے اے ناداں قوت کا سبق لے تو

محنت سے زمانہ نے کیا کچھ نہ ترقی کی
اے مستِ تن آسانی محنت کا سبق لے تو

خود اپنے تنزل سے لے درس ترقی کا
احساسِ حقیقت سے عظمت کا سبق لے تو

اگلوں نے کیا کیا کیا چھوڑ اُن کی ثنا خوانی
اُس جذبۂ وحدت سے وحدت کا سبق لے تو

وہ معرفتِ حق سے شاہوں پہ ہوئے بھاری
تھا اُنکا خدا ناصر نصرت کا سبق لے تو

ہو دُور جہالت سے کھول علم کے دروازے
ہمت کے دکھا جوہر ہمت کا سبق لے تو

تقوے سے ہو دُنیا میں محبوبِ خداوندی
مخلوق کی خدمت سے عزت کا سبق لے تو

اَب وقت عمل کا ہے چھوڑ اپنی غزل خوانی
دیکھ اپنے حریفوں کو غیرت کا سبق لے تو

خودرائی نے اے ناداں قوت کو تری توڑا
اسلام کی وحدت پر بیعت کا سبق لے تو

اَب علم و عمل دونوں مہجور ہوئے مجھ سے
قرآں کی اشاعت سے حکمت کا سبق لے تو

یہ دعوئ قربت بھی اک نفس کا دھوکا ہے
پابندِ شریعت ہو رحمت کا سبق لے تو

دَولت نہیں دُنیا کی آدین کے سایہ میں
اگلوں کے نمونہ سے دولت کا سبق لے تو

طاقت ہو تو مامن ہو بے چارہ و بیکس کا
ملجا ہو غریبوں کا شفقت کا سبق لے تو

جابر کا نہو ساتھی ظالم کا نہو حامی
مغرور ستم راں سے نفرت کا سبق لے تو

گوہر کی نصیحت پہ ناصح نہ سمجھ اس کو
وُہ پیار سے کہتا ہے الفت کا سبق لے تو

اُردو ہماری زبان ہے

(فیض الرحمان فیضی۔ ایم۔ اے)

املا۔ الفاظ۔ محاورے۔ زبان اور روزمرّہ کی اغلاط اور اُن کی تصحیح ہم انشاءاللہ تعالیٰ "المنار" کے ہر شمارہ میں پیش کریں گے۔ طلباء اس جانب توجہ فرمائیں

غَلَط	صَحِیح	غَلَط	صَحِیح
۱۔ بُرقعہ	بُرقَع	۱۱۔ وَطَن	وطن
۲۔ مصرعہ	مصرَع	۱۲۔ جَدّوجہد	جِدّوجُہد
۳۔ رُوحِ رواں	روح و رواں	۱۳۔ اَمروز	اِمروز
۴۔ سلامُ علیکُم	اَلسّلامُ علیکُم	۱۴۔ ظفر جب کالج میں ہوا کرتا تھا	ظفر جب کالج میں تھا
۵۔ مَیَّت	مَیِّت	۱۵۔ تم نے میرے ساتھ پڑھنا تھا	تمہیں میرے ساتھ پڑھنا تھا
۶۔ بمعہ	مع	۱۶۔ مُسوِّدہ	مسَوَّدہ
۷۔ وَقَت	وقت	۱۷۔ مَحبّت	مُحبّت
۸۔ اُفَق یا اُفق	اُفُق	۱۸۔ لاحَق	لاحِق
۹۔ شَمَع یا شمِع	شمع	۱۹۔ بُرا منانا	بُرا ماننا
۱۰۔ صُبَح یا صُبُح	صُبح	۲۰۔ خَتَم	ختم

میاں محمد یونس

سیکنڈ ایئر فولز

میں نے اپنے سبز لکیروں والے سفید رومال سے پسینہ صاف کیا۔ اور بنچ پر دراز ہونے کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگا کہ شاید میرا کوئی دوست یا کلاس فیلو مل جائے اور میں اس سے کچھ باتیں کر سکوں۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے جانے کب طبیعت خراب ہو جائے اور میں کالج کو سلام کر کے گھر کو چل دوں۔

میں حسب معمول آج بھی کالج لیٹ پہنچا تھا۔ پہلے تو میں پہلا پیریڈ اٹینڈ کر لیا کرتا تھا مگر آج کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ میں نے ایک بار کلاس روم میں جانا بھی چاہا۔ مگر پھر کسی خیال سے رُک گیا۔ کلاس میں میرے تینوں دوست بیٹھے تھے۔ جو مجھے اندر آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ مگر مجھے واپس جاتے ہوئے دیکھ کر وہ اشاروں ہی اشاروں میں مجھے ملامتیں کرنے لگے۔

بنچ پر بیٹھے بیٹھے کوئی دس منٹ گزر گئے۔ میرا دل اُکتانے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت میرے پاس کوئی ہو۔ جو مجھے پیریڈ کے ختم ہونے تک باتوں میں مشغول رکھے۔ ہم دونوں خوب قہقہے لگائیں۔ اتنے کہ سارا کالج سر پر اُٹھا لیں۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر میں کسی کلاس میں بیٹھ کر کسی پروفیسر کا لیکچر ہی سن لوں۔ مجھے اپنی غلطی کا پورے طور پر احساس ہوا۔ اور میں پچھتانے لگا کہ میں کلاس روم میں کیوں نہ چلا گیا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کلاسز شروع ہوئے دیر ہو چکی تھی اسلئے اب بھی ناممکن تھا۔ معاً مجھے خیال آیا "میں نے فیس بھی تو ادا نہیں کی ہے"۔ اور میرے قدم خواہ مخواہ کالج آفس کی طرف اٹھنے لگے۔ میں ان ہی خیالات میں غلطاں آفس کے دروازے تک پہنچ گیا۔

یہاں پر بہت سے لڑکے کھڑے تھے جو فیس کی ادائیگی چاہتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد فسٹ ایئر کے لڑکوں کی تھی جنہیں عموماً "فرسٹ ایئر فول" بھی کہا جاتا ہے۔ تقریباً سب لڑکوں نے کونٹر پر اپنی کہنیاں جمائی ہوئی تھیں۔ میں بھی اُن میں گھس گیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد مجھے اپنی دوسری غلطی کا احساس ہوا۔ اور یہ پہلی غلطی سے بھی کچھ سخت قسم کا تھا۔ اس وقت میں حواس باختہ تھا۔ مجھے کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ کہ کیا کروں، کیا نہ کروں۔ ان سب لڑکوں کی گرم سانسوں کی وجہ سے دم لینا مشکل تھا۔ مارے پسینے کے بُرا حال۔ گرمیوں کے دن ہوا نام کو نہیں۔ اور اس پر ستم یہ کہ آفس کا پنکھا کچھ دنوں سے خراب تھا۔ اور ادھر پیاس کے مارے کلیجہ حلق کو آ رہا تھا کونٹر پر ایک گلاس رکھا تھا۔ پانی سے لبالب۔ جسے دیکھ کر پیاس اور شدت اختیار کر گئی تھی۔ میری کہنی گلاس کو لگی۔ پانی میں کچھ تعاش پیدا ہوا۔ کچھ لہریں اُٹھیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ کونٹر پر پانی گرا، اور بہنے لگا۔ اور بہتے بہتے ایک ٹوپی جو پاس ہی پڑی تھی اُسے سیراب کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے اُسے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور کلرک کو فیس دینے میں مشغول ہو گیا۔

کلرک بولا: "آپ کا نام؟" "احمد اختر" میں نے جواب دیا۔ کلاس سیکنڈ ایئر۔ رول نمبر ——— ؟ اور میں نے رول نمبر بھی بتا دیا۔ اس نے رجسٹر کھولا۔ اور فیس درج کرنے لگا ادھر میں نے اپنے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے بائیں طرف ایک فسٹ ایئر کا لڑکا کھڑا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان بالکل میرے رومال کی طرح کا ایک رومال پڑا تھا جس میں کچھ کاغذ وغیرہ بندھے تھے۔ میں نے اُسے دیکھنے کے بعد لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر کلرک کی جانب مُنہ کر لیا۔ اتنے میں گھنٹہ بجا اور اقتصادیات کا پیریڈ شروع ہو گیا۔ یہ مجھے ضرور اٹینڈ کرنا تھا۔ اس لئے کلرک کو جلدی کے لئے کہا۔ اسی اثنار میں میرا ایک دوست اندر آیا اور چلنے کو کہا۔ میں نے جلدی سے رسید لی اور اسے ہاتھ سے تکرتے ہوئے آفس سے باہر نکل

آیا۔ باہر میرے تینوں دوست کھڑے تھے۔ راحل ان سب میں سے مجھے عزیز تھا وہ بھی کسی بات میں مجھے اپنے سے کم نہ سمجھتا تھا۔

میں باہر نکلا تو وہ سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا کر رہے تھے آفس میں؟" فیس ادا کر رہا تھا۔ کیوں پیریڈ اٹینڈ نہیں کرو گے؟" "چھوڑو اس کو پہلے یہ بتاؤ تمہاری کونسی چیز گم ہوئی ہے؟" وہ بولا۔

"میری . . . . . میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی" میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لیتے ہوئے کہا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ باقی دوست بھی مسکرائے اور بولا "ارے بہت بڑی چیز ہے۔ یہ دیکھو" اور یہ کہکر جیب سے ایک لفافہ نکالا جسے دیکھ کر میں حیران ہوگیا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس میں سبز، سرخ اور نیلے رنگ کے کچھ نوٹ تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ میرے تو نہیں ہیں۔ لیکن پھر راحل کیوں کہہ رہا ہے کہ تمہاری چیز گم ہوئی ہے۔ میں عجیب کشمکش میں تھا۔ مگر پھر سمجھ میں آگیا کہ یہ نوٹ میرے نہیں بلکہ راحل کے ہیں جو صرف میرے دوستوں کو غلط فہمی میں رکھنے کے لئے انہیں میرے بتا رہا ہے۔ اور اگر ان لڑکوں کو معلوم ہوجاتا کہ یہ راحل کے ہیں تو پھر ان میں سے بیس یا پچیس روپے تو صاف تھے۔ میں مسکرا دیا۔ اور کہا:۔ "ارے یار یہ تم نے کہاں سے لئے ہیں میری جیب سے تو نہیں نکالے" اور سب لڑکے کھلکھلا کر ہنس دئے۔ ہم نے خوشی خوشی قہقہے لگانے شروع کردئے۔ راحل نے مجھے روپے اس شرط پر دئے کہ آخر دس روپے وہ رکھ لے گا۔ اور سب دوست اس سے چائے پئیں گے۔ میں نے یہ شرط منظور کرلی۔ کیونکہ یہ راحل کی پیش کردہ تھی۔ روپوں کے مالک کی۔ وہ جس طرح چاہتا ان کو خرچ کرتا۔ اس نے مجھے ایک ایک کرکے نوٹ دینے شروع کردیئے۔ یہ سارا معاملہ آفس کے سامنے ہی کھڑے کھڑے ہوا، اور بہت جلد ہوا۔ دوسرے لڑکے بھی ہمیں شور مچاتے ہوئے دیکھ کر کھڑے ہنس رہے تھے۔ راحل کے ہاتھ میں اب صرف دو پانچ پانچ کے نوٹ رہ گئے۔ تو وہ کہنے لگا چلو براڈوے ہوٹل چلیں۔ ہم نے تائید کی۔

عین اس وقت آفس سے شور اٹھا اور بڑی مشکل سے سمجھ میں آیا۔ وہ کچھ اس طرح کہہ رہے تھے۔ رومال گم ہوگیا۔ روپے چوری ہوگئے۔ رومال گم ہوگیا" ابھی ہم سن ہی رہے تھے اور حیران تھے کہ کیا ہوا۔ اتنے میں تین چار لڑکے جن میں وہی فرسٹ ایئر کا لڑکا بھی شامل تھا۔ مع کلرک آئے۔ کلرک نے ہم سے پوچھا "آپ نے کوئی رومال تو نہیں دیکھا جس میں کچھ کاغذات بندھے تھے" جی ہاں کونٹر پر پڑا ہوا دیکھا تھا۔ میں نے جواب دیا "وہ گم ہوگیا ہے، آپ ذرا اپنے اپنے رومال دکھائیں" ہم سب نے اپنے اپنے رومال دکھائے۔ میں نے بھی اپنا رومال نکالا۔ وہی سبز لکیروں والا سفید رومال۔ میرا رومال دکھانا ہی تھا کہ وہ لڑکا بولا "یہ رومال میرا ہے۔ تم نے چوری کی ہے تم چور ہو" وہ ایک ہی سانس میں جانے کتنے الزام لگا گیا۔

"ارے یہ رومال تمہارا ہے! وہ کس طرح؟ یہ تو میرا ہے" میں نے اس کے قریب تر ہوتے ہوئے کہا "تم نے چوری کی ہے۔ یہ روپے بھی میرے ہیں۔ تم چور ہو" قریب ہی تھا کہ میں اس سے لڑ پڑتا کہ آفس کلرک بولا "احمد صاحب میں آپ سے اس قسم کی حرکت کی توقع نہ رکھتا تھا۔ آپ اتنے بڑے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس قسم کی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ آپ میرے ساتھ پرنسپل صاحب کے پاس چلیں" اور میں حیران و پریشان کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ روپے تو راحل کے ہیں۔ یہ لڑکا کون ہے؟ ان روپوں کا اس سے کیا تعلق ہے۔ اور یہ کلرک کیا کہہ رہا ہے؟ یہ رومال تو میرا ہے۔ میرا دماغ اس معمہ کو حل کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے بڑی ہمت کرکے راحل سے معاملہ سلجھانا چاہا "کیوں بھئی یہ روپے تمہارے نہیں ہیں؟" "میرے"؟ وہ ایک دم بولا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو۔ "وہ کیسے ابھی تو تم انہیں اپنا کہہ رہے تھے" ——— "لیکن یہ روپے تم نے کہاں سے لئے؟" میں نے مجسم سوال بن کر راحل سے پوچھا۔ راحل نے اپنی جیب سے میرا ہی جیسا دوسرا رومال، سبز دھاریوں والا، نکالتے ہوئے مجھ سے پوچھا:۔ "کیا یہ رومال تمہارا نہیں ہے؟"

نورالدین امجد

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

بعض دفعہ واقعات کا تطابق کس قدر حیرت انگیز ہوتا ہے نہ جانے صرف چند ہی روز پہلے سے فیض کا ایک شعر مجھے بار بار کیوں یاد آرہا تھا

زندگی گویا کہ مفلس کی قبا ہے جس میں ⁂ ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

بالکل انجانے طور پہ میں نے یہ شعر کئی مرتبہ گنگنایا اور پھر ایک سہ پہر کو جب ہم سیر کیلئے باہر گئے تو بارش سے دھلی ہوئی نرم ریتلی زمین پر کچھ لکھنے کو میرا جی للچایا۔ اور ایک نوکیلے پتھر سے جانتے ہیں میں نے کیا لکھا ــــــ بالکل یہی شعر، یہ ایک بے اختیارانہ حرکت تھی ورنہ ان دنوں مجھے کوئی دُکھ نہیں تھا۔ چھٹیوں کے طویل دن انتہائی بے فکری سے گزر رہے تھے اور ایک چاہنے والی ماں اور محبت کرنے والی بہنوں کے درمیان رہتے ہوئے دُکھ ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ــــــ مگر شاید عین اسی وقت انسانی فہم کی حدود سے دُور، بہت دور ہماری زندگیوں کے لیئے ایک بہت بڑا پیوند تیار ہو رہا تھا ــــــ ۲۴ اگست کی صبح گرمیوں کی عام صبحوں کی طرح ہم پہ طلوع ہوئی بحسب معمول ہم صبح کی سیر کیلئے جانے لگے تو امّی نے کہا آج جمعہ ہے چلو قبرستان ہو آئیں۔ (کچھ دیر کے بعد ہم قبرستان میں تھے) جس قبر پہ ہم دُعا کر رہے تھے، اُس کے ساتھ ہی گورکن ایک نئی قبر کھود رہا تھا۔ اس دن مجھے اس کے کام سے ایک عجیب دلچسپی محسوس ہوئی۔ دُعا ختم کرتے ہی میں نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کے کام کے متعلق اور اس قبر کے متعلق۔ اسوقت ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ غروبِ آفتاب تک یہی قبر ہماری زندگی میں کیا مقام حاصل کر لے گی۔

سیر سے واپسی پہ ناشتہ ہوا، اور ناشتے پہ ہم کتنے ہنسے۔ کوئی دس بجے ہونگے میں اندر کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا، جب ڈیوڑھی پہ دستک ہوئی اور امّی نے مجھے بلایا کہ یہ تار پڑھ دو۔ واقعات سے بیخبر میں نے بڑی بے خیالی میں لفافہ چاک کیا۔ اور جونہی میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں تو ایک دم میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پل بھر میں بیسیوں خیالات میرے ذہن میں آ گئے "شاید میں ہوش میں نہیں ہوں" "شاید میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں" "ہو سکتا ہے پیغام غلط وصول کیا گیا ہو" یا "تار غلطی سے ہمارے گھر آگیا ہو" مگر نہیں، تار کی عبارت غیر معمولی طور پر واضح تھی۔ امّی کے پیہم اصرار نے مجھے چونکا دیا اور محبت کے مجسمہ کی پریشان صورت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جانے میں نے کس طرح کہہ ہی ڈالا "دولہا بھائی کا تار ہے جہلم سے۔ باجی فوت ہو گئی ہیں" چند چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ مگر ان چیخوں میں شور نہیں ایک سناٹا تھا ــــــ قبرستان کا سا سناٹا۔

صبح کا نظارہ میری آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ قطار اندر قطار کتبے اور کھدی ہوئی قبر، مگر وہ معصوم سی قبر اب ایک تاریک اور ڈراؤنا غار معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا باجی تو اندھیرے سے اتنا ڈرتی تھیں اب وہ اس اندھیرے غار میں کیسے رہیں گی؟ ایک خیال میرے دل میں آیا "اگر یہ خبر غلط ہوئی تو . . . " اور خوشی کی ایک لہر میرے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ مگر جونہی میں نے امّی کی طرف دیکھا یہ عارضی مسرت، ماممتا کے آنسوؤں میں تحلیل ہو گئی۔

دن کا باقی حصہ عجیب طرح گذرا۔ کبھی خیال آتا کہ یہ سب جھوٹ ہے کل ہی تو باجی کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط آیا ہے اور اس میں نہ علالت کا ذکر ہے نہ کوئی اور شکایت۔ مگر یہ تار ــــــ آخر اس کا کچھ تو مطلب ہے۔

باجی کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ اُن کی خوش خلقی اور اُن کی نیکی، ان کی محبت اور ان کا پیار، اور پھر ان کی شادی جب باجی رخصت ہوئیں تو کتنی بندوقیں سر کی گئی تھیں۔ مبارکبادی کا ایک شور تھا۔ اور کتنی رونق تھی ہمارے گھر میں ــــــ مگر اس ساری رونق کے پس منظر میں ایک چہرہ تھا، جس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ ماممتا کے انمول آنسو۔ میں نے مڑ کے دیکھا۔ آج بھی ہمارے ہاں بڑی رونق تھی۔ مگر ایک سوگوار رونق۔ اور آج پھر امّی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مگر ان

آنسوؤں میں خون کی جھلک تھی۔

شام کے چار بجے ایک ٹیکسی ڈیوڑھی کے سامنے آکر رکی۔ پچھلی سیٹوں پر باجی اپنی آخری نیند سو رہی تھیں۔ زرد اور بے جان پھر سے ایک کہرام مچ گیا۔ ہچکیوں کے درمیان مری ہوئی آواز میں امّی دولہا بھائی سے کچھ کہہ رہی تھیں: "بیٹا آج سے سوا برس پہلے میری بچی کو تم اسی طرح موٹر میں لے کر گئے تھے . . . " آواز ڈوب ہو گئی اور میں کچھ نہ سن سکا۔ بوڑھی آنکھوں نے بچپن سے شادی تک سب واقعات دیکھے تھے اور اب وہ سب واقعات کس قدر تیزی سے دماغ کے پردے پر سسکیاں بھر رہے تھے۔

جب باجی کو آخری غسل کے بعد لٹا دیا گیا تو ان کا جسم مہک رہا تھا اور ان کے چہرے پر ایک ابدی بے فکری تھی۔ ڈیزی، (میری چھوٹی بہن) کہہ رہی تھی "امّی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باجی زندہ ہیں۔ ان کا جسم ہل رہا ہے۔" مجھے یاد آیا کہ جب ابا جان کا انتقال ہوا تھا۔ تو میں نے بھی ٹھیک یہی کہا تھا اور امّی نے آج کی طرح جواب دیا تھا "ہاں بیٹا اچھی طرح دیکھ لو، پھر تمہیں ابا نظر نہیں آئیں گے۔" ——— مغرب کے وقت جب ایک لٹا ہوا قافلہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا تو بہن کے تابوت کا ایک کونا ایک بھائی کے کندھے پر تھا۔ بہن کے بے جان جسم کو کاندھا دیتے ہوئے کس قدر تکلیف ہوتی ہے؟ یہ صرف اُسی کو معلوم تھا۔

جب میں میٹرک میں تھا تو باجی مجھے پوئٹری پڑھایا کرتی تھیں۔ لیمپ کی روشنی میں ان کا دمکتا ہوا چہرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ لحافوں میں دبکے ہوئے میں پڑھتا اور وہ پڑھاتیں۔ ایک روز ہم ایک نظم پڑھ رہے تھے "مہربانی سے پیش آؤ" اس میں ایک قطعہ (**Stanza**) آتا تھا:-

"اپنی بہن سے بھی مہربانی سے پیش آؤ، بہتوں کو بہن کی محبت کی اصل گہرائی کا علم نہیں۔ سمندر کی
دولت کوسوں نیچے ہوتی ہے اس سطح سے، جو اوپر جگمگاتی ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس قطعہ کو پڑھ کر باجی پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکیں "پیارے فرو! کاش تم سمجھ سکتے یہ قطعہ کس قدر سچ ہے" اور خاموش ہو گئیں۔ ——— آج جب باجی کا تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ایک انمول موتی سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں روپوش ہو رہا ہے۔

ٹھیک ایک ماہ بعد ۲۳ ستمبر کو میں نے کالج میں قدم رکھا تو گیٹ پر پروفیسر عباس صاحب ملے۔ اپنے مخصوص شفقت بھرے لہجے میں انہوں نے پوچھا "کیوں میاں خیریت ہے؟" ——— ایک اذیت ناک احساس مجھ پر غالب آ گیا۔ جی چاہا رو دوں۔ مگر میرے منہ سے نکلا "جی ہاں خیریت ہے۔" ——— سارا نظارہ میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ پلکوں پر دو گرم گرم آنسو ڈھلک آئے، شاید کہہ رہے تھے ؎ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ٭ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی۔

بقیہ دھوپ چھاؤں:- ادھر رحمت اور اسکی بیوی چادریں ہلاتے کھیتوں میں دوڑ رہے تھے۔ ہل۔ ہا۔ ہا۔ ہو۔ ہو۔ ہا۔ ہا کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑے دیتی تھیں۔ ایک حشر برپا تھا۔ دھوپ۔ تکان اور پیاس کا کسی کو خیال تک نہیں تھا۔ بس ٹڈی اڑانے کی فکر پڑی تھی۔ ٹڈی جس جگہ بیٹھ جاتی اُٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ بلا ٹلی۔ اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

جب کھیتوں کا معائنہ کیا گیا۔ تو رحمت کے کھیت کو اگرچہ تھوڑا بہت نقصان ہوا مگر دوسرے کسان رو رہے تھے۔ مصیبت کے دکھڑے سنا رہے تھے۔ کل وہ خوشیاں منا رہے تھے آج رو رہے ہیں۔ کل رحمت کف افسوس مل رہا تھا۔ لیکن آج وہ خوش ہے بہت خوش ——— اس سال خدا کے فضل سے رحمت کے اتنی فصل ہو گئی تھی کہ سب دھونے دُھل گئے۔ اس نے ایک اچھا سا مکان تعمیر کرایا۔ بیل نئے خرید لئے۔ اور گاؤں کا چودھری کہلایا۔

سمیع اللہ قریشی ندیم تاثیر

احساس

چند مظلوم لرزتی ہوئی آوازوں کو،
جانے کیوں چھوڑ گیا ہے کوئی ویرانوں میں
توڑ کر جیسے چلا جائے کوئی سازوں کو،
اُن شکستوں کی ہے آواز اب انسانوں میں
ہمنشیں! میرے ٹھہرنے کا نہیں ہے امکاں
اپنی منزل کی طرف مائلِ پرواز ہوں میں
ہمو طن میرے مجھے کہتے ہیں باغی انساں
ورنہ سچ یہ ہے کہ ٹوٹا ہوا اِک ساز ہوں میں
کاش آلام کی رفتار بدل سکتا میں
کسی معصوم کے "احساس" کو میں چھو آتا
اپنے اُلجھے ہوئے افکار بدل سکتا میں
کسی مظلوم کے افلاس کو میں چھو آتا
خون میں ڈوب کے نکلے ہیں یہ آزاد افکار
اِنہیں اب کیسے میں زندانوں میں محبوس کروں
مجھے کچھ اور بھی کہنے سے نہیں ہے انکار
کیوں نہ انسان کو "احساس" سے مانوس کروں
تیری تکلیف کا ہر وقت ہے "احساس" مجھے
تیری خاطر میں چٹانوں سے بھی ٹکراؤں گا
آ ہی جائیگا یہ ماحول کبھی راس مجھے
اپنی کھوئی منزل کو میں پھر پالوں گا!

راحت ملک

غزل!

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی
شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
تم خدارا یہاں چلے آؤ
زندگی مختصر نہیں ہوتی
یہ سویرا عجب سویرا ہے
تیرگی منتشر نہیں ہوتی
آپ کی یاد ایک لمحہ بھی
آپ سے بے خبر نہیں ہوتی
ڈوب ہی جاؤ ڈوبتی نبضو!
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
بے خودی کی عجیب حالت ہے
آپ سے پیشتر نہیں ہوتی
آپ شکوا فضول کرتے ہیں
ہم کو اپنی خبر نہیں ہوتی

جانے کیا بات ہے کہ اب راحت
اُن کی آمد اِدھر نہیں ہوتی!

"سیلانی"

سیلانی کا سفرنامہ

"المناز" میں دو قسطیں اس سفرنامہ کی مسلسل شائع ہو چکی تھیں کہ درمیان میں کھانچہ پڑ گیا۔ بہر حال اب تیسری کی باری ہے۔ "باری" سے مراد مولانا باری نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جلاج عوامی مسلم لیگ کا پٹا ہوا مہرہ ہے اور میدانِ سیاست کی پچھلی گھوڑی۔ جسے آغا خانِ سیاست یعنی پہلے بیچارے نواب ممدوٹ صاحب نے ریس (RACE) کیلئے لگوا تو دیا تھا، مگر ہر بار ــــ (؟) غرضیکہ مطلب اس باری سے نزدہ تھا۔ اور نہ یہ ہے کہ باری کا بخار چڑھ رہا ہے آگاہ صاحب کو۔ چونکہ باری کا بخار درمیانی وقفوں کے ساتھ آتا ہے اور آگاہ صاحب آنجہانی بھی انڈوارسے کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ (باری کے بخار میں مبتلا ہونیوالے پر چونکہ ہذیانی کیفیت کا غلبہ بھی ہوتا ہے) مثلاً فرض کیجئے کہ مریض سستا نثر نگار ہو اور عموماً ڈائریاں وغیرہ لکھ کر بسر اوقات کرتا ہو۔ جب وہ باری کے بخار کا شکار ہوگا۔ تو یوں بہکیگا:۔

پانچ منٹ میں دو سو شعر کہتا ہوں (حالانکہ آپ شاعر اعرفاک نہیں)۔ کاندھے پر رکھ دوں اپنا شعر تو کہاں معلوم ہو گے۔ میاں، عیسیٰ خاں بھی میرا شاگرد ہے۔ "کوئے ملامت" کے مشاعروں میں شمع اور اختر نے مجھ سے زیادہ کسی شاعر کو داد نہیں دی۔" (پھر یکایک دوسری کروٹ بدلیں گے) پرسوں فیروز سنز کا خط آیا تھا کہ چھوڑو اس شاعری دعوی کو (گویا کہ آپ کو یہ دعویٰ بھی ہے) لاہور کی ڈپٹی کمشنری کی آسامی خالی ہے۔ آجاؤ! (ایک اور پلٹا کھائیں گے پھر) وہ ہیں نا نواب بھوپال، پرسوں ان کی درخواست آئی تھی کہ مدھیہ بھارت یونیورسٹی آپکو پرچۂ جہالت کا ممتحن مقرر کرتی ہے: قبول فرمائیے۔ جانتے ہو بیغامی صاحب! ہم نے کیا کہا؟ ہم نے فرمایا، کہ نہیں، ہم کراچی جائیں گے۔ کیونکہ وہاں "بطخے" افراط سے بلا خدشہ مل جاتی ہے۔"

تو بھائی قارئینِ "المناز"! "باری" سے مراد یہ باری بھی نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس سفر کی یہ تیسری قسط ہے۔ جو اللہ کا نام لیکر ہم شروع کرتے ہیں تو سُرخوں کے ایجنٹ بڑے حضرت عبداللہ ملک۔ محمد صفدر۔ ح، ع، حسرت۔ عارف متین۔ شیر محمد اختر۔ چچا یوسف ظفر عرف ریڈیو اسٹیشن راولپنڈی زندہ باد۔ ایوب کرمانی۔ ابراہیم جلیس اور بھیا ن، م، راشد کی ناراضگی کا خطرہ ہے اور اگر بغیر بسم اللہ کے دھندا لگا دیا تو احسان علی صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ بالآخر ہمیں بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور ہمارا جنازہ بھی ظاہر ہے کہ قبرستان میانی صاحب براہ جنازگاہ ہی جائیگا۔ تو اس وقت وہ ہمیں قبرستان میں دفن نہ ہونے دیں گے اور کہہ دینگے کہ یہ تو کمیونسٹ یعنی ملحد تھا۔

لہذا اس مرتبہ بسم اللہ، بے بسم اللہ کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ ہاں، تو پرسوں ہم ننگا رغلانے پہنچے ہی تھے کہ معلوم ہوا، مال روڈ سے ابھی ابھی طوائفوں کا ایک جلوس ٹیڑے کو نُرے بول الاپتا گزرا ہے۔ ہم ہو گئے سراپا سوالیہ نشان۔ جیسے (؟) منظر محمد خاں بنے رہتے ہیں۔ بریلی والے مراد آبادی نقشین خانصاحب نے انشورنس کمپنی کی قسم کھا کر کہا کہ سیلانی صاحب! طوائفوں کا یہ جلوس کراچی تک پیدل ہی جائیگا۔ اور وہاں ہمارے وزیر نشۃ الصوت سے یہ عورات (عورتوں کی جمع) فریاد کرینگی۔ کہ لاہور کے بھونپو بھنڈار پر صرف "تعلقات" کی بنا پر پروگرام مل سکتے ہیں۔ اور تعلقات کیلئے ہماری عمر و صورت مارج ہیں۔ چنانچہ تمام اچھی گانے والیاں اور اچھے گانے والے شاہی محلہ میں سوہنی۔ تلک کامود۔ بھیروں۔ جوگیا۔ کالنگڑا۔ پوربی۔ بھیرویں۔ ٹوڈی۔ میاں کی ٹوڈی۔ پوربی ٹوڈی اساوری۔ دھناسری۔ جونپوری۔ باگیسری۔ سارنگ۔ گوڑ سارنگ۔ بھیم پلاسی۔ پیلو۔ بردا پیلو۔ ملتانی۔ گوڑی۔ دیپک۔ مالکوس بہاگ۔ بہاگڑا۔ ایمن۔ شیام کلیان۔ چھایا۔ گارا۔ کھماج۔ دیس۔ دیسی۔ کامود۔ پوریا۔ کافی۔ سیندورا۔ غرضیکہ سولہ راگ اور چھتیس راگنیوں کا ریاض کرتے کرتے مر گئے۔ اور یہ لونڈیاں اٹھیں اور چل بھونپو بھنڈار "ایمپرر" روڈ پر فلمی گانے کے علاوہ تو ان سے کچھ سن لو۔ بھونپو بھنڈار والوں کی موٹر بجائے معززین اور ذی عزت نشرکاروں کے ان بیسواؤں کو لینے جاتی ہے۔ بلکہ دن بھر رہتی بھی انہی محلہ میں ہے۔ مقصد چونکہ تعلقات لازمی ہیں۔ اس لئے ساز ندے بھی وہی کھپتے ہیں۔ جن کے لئے کسی چشم یار کی شہ پائی جائے۔ ورنہ

"سیلانی"

سیلانی کا سفرنامہ

"المنار" میں دو قسطیں اس سفرنامہ کی مسلسل شائع ہو چکی تھیں کہ درمیان میں کھانچہ پڑ گیا۔ بہرحال اب تیسری کی باری ہے۔ "باری" سے مراد مولانا باری نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جناح عوامی مسلم لیگ کا پٹا ہوا مہرہ ہے اور میدانِ سیاست کی پچھاڑی گھوڑی۔ جسے آغا خان سیاست یعنی ہمارے لیے چارے نواب ممدوٹ صاحب نے ریس (RACE) کیلئے لگوا تو دیا تھا، مگر ہر بار ــــ (؟) غرضیکہ مطلب اس باری سے نزدہ تھا، اور نہ یہ ہے کہ باری کا بخار چڑھ رہا ہے آگاہ صاحب کو۔ چونکہ باری کا بخار درمیانی وقفوں کے ساتھ آتا ہے اور آگاہ صاحب آنجہانی بھی اٹھوارے کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ (باری کے بخار میں مبتلا ہونیوالے پر چونکہ ہذیانی کیفیت کا غلبہ بھی ہوتا ہے) مثلاً فرض کیجئے کہ مریض سے تا نثر نگار ہو، اور عموماً ڈائریاں وغیرہ لکھ کر بسر اوقات کرتا ہو۔ جب وہ باری کے بخار کا شکار ہوگا۔ تو یوں بہکیگا:۔

پانچ منٹ میں دو سو شعر کہتا ہوں (حالانکہ آپ شاعر اعرفاک نہیں)۔ کاندھے پر رکھ دوں اپنا شعر تو کہاں معلوم ہو گے۔ میاں، علیسی خاں بھی میرا شاگرد ہے۔ "کوئے ملامت" کے مشاعروں میں شمع اور اختر نے مجھ سے زیادہ کسی شاعر کو داد نہیں دی"۔ (پھر یکایک دوسری کروٹ بدلیں گے) پرسوں فیروز سنز کا خط آیا تھا کہ چھوڑو اس شاعری بے امری کو (گویا کہ آپ کو یہ دعویٰ بھی ہے) لاہور کی ڈپٹی کمشنری کی آسامی خالی ہے۔ آجاؤ! (ایک اور پلٹا کھائیں گے پھر) وہ ہیں نا نواب بھوپال، پرسوں ان کی درخواست آئی تھی کہ مدھیہ بھارت یونیورسٹی آپکو بحیثیت جہالت کا ممتحن مقرر کرتی ہے: قبول فرمائیے۔ جانتے ہو پیغامی صاحب! ہم نے کیا کہا؟ ہم نے فرمایا کہ نہیں، ہم کراچی جائیں گے۔ کیونکہ وہاں "ابطے" افراط سے بلا خدشہ مل جاتی ہے"۔

تو بھائی قارئین "المنار"! "باری" سے مراد یہ باری بھی نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس سفر کی یہ تیسری قسط ہے، جو اللہ کا نام لیکر ہم شروع کرتے ہیں تو شرخوں کے ایجنٹ بڑے حضرت عبداللہ ملک۔ محمد صفدر۔ پ، ح، حسرت۔ عارف متین۔ شیر محمد اختر۔ حجا یوسف ظفر عرف ریڈیو اسٹیشن راولپنڈی زندہ باد۔ ایوب کرمانی۔ ابراہیم جلیس اور بھیا ن۔ م۔ راشد کی ناراضگی کا خطرہ ہے اور اگر نجیر بسم اللہ کے دھندا لگا دیا تو احسان علی صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ بالآخر ہمیں بھی ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور ہمارا جنازہ بھی ظاہر ہے کہ قبرستان میانی صاحب براہ جنازگاہ ہی جائیگا۔ تو اس وقت وہ ہمیں قبرستان میں دفن نہ ہونے دینگے اور کہہ دینگے کہ یہ تو کمیونسٹ یعنی ملحد تھا۔

لہٰذا اس مرتبہ بسم اللہ، بے بسم اللہ کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ ہاں، تو پرسوں ہم نگار خانے پہنچے ہی تھے کہ معلوم ہوا، مال روڈ سے ابھی ابھی طوائفوں کا ایک جلوس بڑے کن سُرے بول الاپتا گزرا ہے۔ ہم ہوگئے سراپا سوالیہ نشان۔ جیسے (؟) منظر محمد خاں بنے رہتے ہیں۔ بریلی والے مراد آبادی نقشین خانصاحب نے انشورنس کمپنی کی قسم کھا کر کہا کہ سیلانی صاحب! طوائفوں کا یہ جلوس کراچی تک پیدل ہی جائیگا۔ اور وہاں ہمارے وزیر نشرو اشاعت سے یہ عورات (عورتوں کی جمع) فریاد کرینگی۔ کہ لاہور کے بھونپو بھنڈار پر صرف "تعلقات" کی بنا پر پروگرام مل سکتے ہیں۔ اور تعلقات کیلئے ہماری عمر و صورت مانع ہیں چنانچہ تمام اچھی گانے والیاں اور اچھے گانے والے شاہی محلہ میں سوہنی۔ تلک کامود۔ بھیروں۔ جوگیا۔ کالنگڑا۔ پوروی۔ بھیرویں۔ ٹوڈی۔ میاں کی ٹوڈی۔ پوربی ٹوڈی اساوری۔ دھناسری۔ جونپوری۔ باگیسری۔ سارنگ۔ گوڑ سارنگ۔ بھیم پلاسی۔ پیلو۔ برو پیلو۔ ملتانی۔ گوری۔ دیپک۔ مالکوس بہاگ۔ بہاگڑا۔ ایمن۔ شیام کلیان۔ چھایا۔ گدارا۔ کھماج۔ دیس۔ دیسی۔ کامود۔ پوریا۔ کافی۔ سیندورا۔ غرضیکہ سو راگ اور چھتیس ۳۶ راگنیوں کا ریاض کرتے کرتے مر گئے۔ اور یہ نوچیاں اٹھتیں اور چل بھونپو بھنڈار کے "ایمپر" ریڈیو فلمی گانے کے علاوہ تو اکثر سے کچھ نہ لو۔ بھونپو بھنڈار والوں کی موٹر بجائے مقبرے اور ذی عزت نشر کاروں کے ان بیسواؤں کو لینے جاتی ہے۔ بلکہ دن بھر بیٹھی ہی اُس محلہ میں ہے۔ مقصد چونکہ تعلقات نوازی ہے۔ اس لئے سازندے بھی وہی کھپتے ہیں جن کے لئے کسی چشم یار کی شہ پائی جائے۔ ورنہ

پھر اکرو سنے ہوئے "آفتاب موسیقی"!

ہم نے برف کی قلفی کھا کر ٹھنڈا سانس کھینچا۔ خانصاحب بولے ۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ بھونپو بھنڈار لاہور پر شریف زادیوں اور پردہ دار خواتین کو بھی ہم طوائفوں کی سطح پر آکر ان پروگرام انچارجوں سے ملنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ ملک صاحب! تم ہی کہو، جب شریفوں کی بہو بیٹیاں ہی ہماری جگہ لے لینگی تو ہم کیا حج کرنے چلی جائیں؟ ——— ہم نے گرم چائے کا گھونٹ لیکر آہ بھری۔ پھر کہا۔ خاں صاحب! آپ ذبیح اللہ صاحب کی سائیکل لیکر دوڑ جائیے اور ان "ٹھمریوں" پر ہمارا یہ "خیال" ظاہر کر آئیے کہ تم لوگ فوراً ایک مشاعرہ منعقد کرو۔ جس کا نام ہونا چاہیئے "بھونپو بھنڈار لاہور کا آپ سے مخاطب مشاعرہ" کاشمیر ظہیری سے خطبۂ صدارت پڑھواؤ۔ اسٹیج سیکرٹری کا کام لاالقاصفی پوری سے لو۔ اور عظیم اللہ ان مشاعرے والے نابالغ شاعر سے میاں کی ملہار میں غزلیں "گواؤ" ———

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ آگیا، ایک بڈھ دو ($\frac{1}{2}$) اور آتے ہی ہمارے مشورے میں دخل در معقولات کرکے کہنے لگا۔ بھئی! مجھے اور میرے استاد کو تو نفرت ہے تمہارے ان مشاعروں سے۔ یہ کیا بیکار مشغلہ ہے؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس لاہور میں ہر ہفتہ ایک مشاعرہ کہیں نہ کہیں ضرور ہوجاتا ہے۔ کان پک گئے ان مشاعروں کے نام سے۔ اور میرے تو پاؤں بھاری ہوجاتے ہیں، جب کسی شاعر کی صورت دیکھ لیتا ہوں ——

الطاف مشہدی نے لقمہ دیا ——— خیر میاں! تم تو بڑی لگان وصول کئے جاؤ۔ مگر یہ جو تم نے اپنے استاد کا نام لیا ہے تو یہ تو بتاؤ کہ جن مشاعروں میں خرچی نہیں ملتی بس انہیں سے نفرت ہے ——— یا؟ بولو! کیوں سکتہ کیوں ہوگیا۔ شرم نہیں آتی، شاعر شعر، شاعری اور مشاعروں کو برا کہتے ہوئے۔ جس تھالی میں کھائیں اس میں چھید نہیں کیا کرتے۔ کل کہو گے کہ جوش اور جگر مشاعروں کو کوسنے لگے۔ اب رہی کان پکنے کی بات کہ مشاعرہ کے نام سے کان پک اٹھتے ہیں۔ تو یہ جو روزانہ سینما ہوتے ہیں، ان سے طبیعت کیوں نہیں اکتاتی۔ اور ہر روز جو یہ اولمپکس ہوتے ہیں۔ آئے دن پنجاب میں دنگل اور کبڈیاں ہوتی ہیں، تو تمہیں خفقان اور مالیخولیا کیوں نہیں ہوجاتا، اور یہ جو صبح سے رات تک ریڈیو انہیں شعراکی آخور گھول گھول کر تم کو پلاتا رہتا ہے تو اسوقت تمہاری نبضیں سرد کیوں نہیں ہوجاتیں؟

بات جانے کہاں تک پہنچی۔ اور کسی کو "عارضۂ استرخاء الشرج" (ایک طبی اصطلاح) ہوا یا نہیں، بہرکیف ہم نے سمجھ لیا کہ آج الطاف مشہدی نے اس $\frac{1}{2}$ آدمی کو جنتری میں سے ضرور نکال دیا ہے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور بغیر سلام دعا کئے چھوٹے بچے والے لہولہاتی کی طرح چل پڑے۔ (کیونکہ ان کو بھی ان کے اتالیقوں نے سلام کرنے کی عادت نہیں ڈلوائی تھی)۔ ہم میک روڈ پر حسین ہال کے پاس ہی پہنچے تھے کہ شاعر کٹ پیس، رشک شب دیجور سامنے سے آتا ہوا نظر آیا، اور ہمارے ذہن میں حضرات علمدار حسین کا فرمان "بجھا تیری لالٹینا" تازہ ہوگیا۔ ہم نے سوچا۔ کہ پلینترا دیکر دھوبی پاٹ اڑادیں۔ مگر اس ظالم نے مشکیں کس لیں اور کہنے لگا، یہ میرا سولہ صفحے کا اردو فارسی دیوان لیتے جائیے۔ نذر ہے ہم نے کہا:— کیا سمجھے۔ لیکن یہ فقرہ کہتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے کہ مبادا! پکڑ نہ لے اور ہمیں بھی نقل پر وجیکٹ میں گنے کا کھیت بونا پڑے۔ ہمایوں روڈ پر کلٹ اڑے جارہے تھے کہ زیدی نے گھیر لیا۔ اور بولا کیوں صاحب! یہ سکندر بن اعظم کا کراچی پر حملہ "تو غضب کا لکھا ہے۔ ہم نے کہا۔ کہ میاں: وہ تو مسٹر عبدالواسع کی توپ نے داغا تھا، تم ہمارا راستہ کھوٹا نہ کرو۔ کہیں وہ یہ مچھیرا ہمیں نہ آگھیرے۔

جیسے تیسے راستے کی بلاؤں سے بچتے بچاتے بھاٹی دروازہ پر ہی پہنچے تھے کہ "بڑا اندھیرا ہے" مل گیا۔ بولا: "آج پلواؤ میں بہت تھکا ہوا ہوں" ہم نے منظور کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ حضرت جی! بس اسی ہوٹل کی چائے سب سے اچھی ہوتی ہے۔ یہ ہوٹل سرکلر روڈ اور لوئر مال کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ سامنے ہی بھاٹی دروازہ نظر آتا ہے۔ داہنی جانب کو مڑئیے تو داتا صاحب کو راستہ جاتا ہے۔ بائیں کو پھریئے تو ضلع کچہری اور ہمارا تعلیم الاسلام کالج آجائیں گے۔ چنانچہ ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی میز کرسیوں پر ہم دونوں بیٹھ گئے "بڑا اندھیرا ہے" تو گردن کو ایک طرف ڈھلکائے بیٹھا رہا۔ مگر ہم ٹھہرے سیلانی۔ ہم نے بورڈوں پر نظر ڈالی۔ چنانچہ اسی ہوٹل کے دروازہ پر بائیں جانب جو نیلی بورڈ ہے اسپر لکھا تھا:— ——— ہماری چائے شقاوت قلب کو دور کرتی ہے ——— ہماری نظر ابھی اس عبارت سے ہٹی بھی نہ تھی کہ وہ بولا۔ حضرت جی! میں روز یہیں بیٹھتا ہوں۔ آجایا کیجئے کبھی کبھی درویش کے پاس ——— درویش پر ایک لطیفہ یاد آگیا۔ پچھلے دنوں روزنامہ آفاق کے ایک رکن ادارہ (جو روزنامہ ڈان، کراچی کے رپورٹر ہوگئے ہیں) کا ایک مضمون آفاق کے ہفت روزہ ایشوع میں طبع ہوا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کیا بننا پسند کرینگے؟ آدمی یا شیطان یا صوفی؟

کیا جانیں گے آپ؟ ساتھ ہی ہدایت دیدی تھی کہ آدمی بننا یوں سخت ہے کہ اس میں پڑھنا لکھنا پڑتا ہے۔ عابد، راست گو، با اخلاق اور امین بننا پڑتا ہے۔ شیطان بننا یوں کڑا ہے کہ صبح سے شام تک لاحول کے درّے پڑتے ہیں۔ لیکن صوفی بننا نہایت آسان اور سہل ہے۔ ہر طرف سے آؤ بھگت۔ گلی گلی بزرگی کی دھاک ہر طرف سے چھنا چھن (وغیرہ) ——— یہ مضمون پڑھا تو ایک مڈل پاس ماسٹر جی بہت بگڑے۔ اور بولے کہ وہ صاحب ہمارے بزرگوں پر بہ کمیونسٹ تبرا بھیجنے لگے۔ ہمیں اُس پر خود غلط پہ ہمیشہ رحم آتا رہا ہے، مگر اُس وقت بہت ہی رحم آیا اور سمجھایا کہ میاں! جو سچی اور دو ٹوک بات کہے، وہ کمیونسٹ؟ جو حق کا علم بلند کرے وہ کمیونسٹ۔ کیا بکواس ہے یہ؟ آجکل جو ننگے خرقہ پوش احرام، بزرگانِ سلف اور شریعتِ محمدیہ کا مذاق اُڑاتے پھرتے ہیں۔ جاہل پیر اور صوفی بنے ہیں۔ ... بناتے ہیں، ہتھ پھیری کرتے ہیں۔ چاندی بٹورتے ہیں، ... اور تمام خباثت پر لبادۂ تصوف رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ان ریاکار، مکار، عیار اور دشمنِ ملت لوگوں کو عوام کو روشناس کرایا جائے تو آفاقی اور صاحبِ مضمون کو کیسے ہوا؟ شرم کرو۔ بے حیائے اور شریف لوگ ہم مسلمانوں کے ہمدرد ہیں۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ ان تمام ننگِ اسلام مسٹنڈوں کو پولیس اپنی نگرانی میں رکھے تو بہتر ہے۔ یہ کمبخت، تعویذوں کیلئے سفید مرغ منگوانے والے، ہماری ملت کی نبضوں کا ناسور ہیں۔ ماسٹر جی تبری ان باتوں سے کسمسائے۔ مگر فوراً ایک رباعی کی قسم کی بے وزن دلیے بحری ... لکھ کر ہماری طرف بڑھائی۔ (یاد رہے کہ یہ وہی ماسٹر جی ہیں جو "فی البدیہہ" شعر کہنے میں لور پرائمری اسکولوں میں حواراد بنے ہوئے ہیں)۔ مطلب اُس نظمِ منثور کا یہ تھا کہ تُو خود بُرا ہے، ورنہ سب اچھے ہیں۔ ہم نے کہا کہ بات ٹھیک کہتے ہو۔ یہ پولیس والے بننے ڈاکوؤں، چوروں، گرہ کٹوں، اُچکوں، نشہ بازوں اور جواریوں کو اپنے اڈے گڑھے میں لیکر دگڑے میں لیا کرتے ہیں۔ ان سب پولیس والوں کو یہ تبلیغی فی البدیہہ ارشاد بھیج دینا چاہیئے کہ ایک فقیر روشن ضمیر ان تمام ماخوذین کو رہا کرانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اے پولیس والو! تم خود بُرے ہو اور یہ سب لوگ اچھے ہیں۔

"شقاوتِ قلب" دُور کرنیوالے چائے خانے سے ہم اُٹھے، کیونکہ یہ وہی چائے خانہ ہے جہاں پچھلے دنوں ایک غریب گونگی عورت کا قتل ہوا تھا۔ ہم نے سوچا، اگر کوئی ہماری شقاوتِ قلب دُور کرنے پر آمادہ ہو گیا تو ہم ابھی اس کیلئے تیار نہیں ہیں۔ آگے بڑھے تو ملکِ دکن کے مولانا صاحب آتے نظر آئے۔ مسکرا کر عرض کرنے لگے۔ بخاری اللہ شاہ کی تقریر بہ دلّی دروازے سے سُن کر آ رہا ہوں۔ ہم بھی مسکرائے اور فرمایا۔ ہم دلّی دروازے سے ہی ... دھنیا اور پسی ہوئی مرچیں خریدنے جا رہے ہیں۔ اور پسی ہوئی مرچیں اسلئے لا رہے ہیں کہ آدھی تو اُس سادہ کار کو بھیج دینگے جو مخلوقِ خدا کو اپنی زرد پوشی سے دھوکے میں رکھ رہا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مُرشد کا ڈھائی تولہ سونا آنکھوں میں دھول جھونک کر ہڑپ کر گیا ہے اور اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اُس نانگے کو پسی ہوئی مرچیں مزید ہتھیار کا کام دے سکینگی۔ اور آدھی مرچیں اُن مُلّاں بخاری اللہ شاہ کو پیش کر دینگے جو بھولے مسلمانوں کی آنکھ میں فی الواقع مرچیں جھونک رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہماری سیاسی چوکی کا آسن نہ کھسکنے پائے۔ لیکن مسلمانوں کو یاد ہے کہ اب سے صرف ۲½ یا ۳½ سال پہلے تک یہی شاہ جی ہمارے محبوب قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کو کافرِ اعظم کہا کرتے تھے۔ اور ہندو توازی میں تلک لگانے کو تیار تھے۔ پاکستان کو کافرستان آج بھی کہتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ آج بھی انکی سیاسی ٹولی اکھنڈ بھارت کے پروگرام میں وہاں کے نیتا منتری کی مؤید ہے۔ خدا کرے جھوٹ ہو۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ "یوم تشکر" دراصل ملکی انتخابات میں کسی جماعت کے افراد کی ناکامی پر نہیں منایا گیا تھا، بلکہ بھارت کی فوجوں کا ہماری سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والے پروگرام کی اطلاع منظوری کے شکرانہ میں منایا گیا تھا۔ دکنی مولانا بولے، تھوڑی سی مرچیں اُس موچی کو بھی بھیج دیجئے جو "پیغامِ اقبال" سنا سنا کر بھونپو بھنڈار لاہور اور فیروز سنز کو چت کر چکا ہے۔ بھئی داد نہیں ہو سکتی استاد کے اس احسان کی کہ جو آ۔ سانڈ۔ بطخ۔ آبنوسی۔ لہولہائی۔ نیلا اور چشم علی رنگی انوکھے انوکھے آوازے تراشے ہیں ——— یہ باتیں کر کے ابھی راستہ لیا تھا کہ نگار خانے والے ذبیح اللہ صاحب مل گئے۔ ہم نے مزاج پرسی کی تو زیرِ لب گالیاں بک کر فرمانے لگے۔ سیلانی صاحب! ہم تین میں نہ تیرہ میں۔ مگر ہمارے مزاج پاؤں بہت پھیلانے لگے ہیں۔ شاعروں اور مخلصوں کو طعنے دے دیکر بھگایا تھا کہ اب متشاعروں اور ریجکاروں کی دوسری ٹولی نے میرے بھٹے کو آ سنبھالا ہے۔ میں انہیں بھی وبالِ جان سمجھنے لگا ہوں مگر ——— خود کردہ را ...؟ اور سیلانی صاحب! آپکو تو ہم خیر مُرتد کہتے ہی ہیں ——— ہم نے فرشی آداب پیش کئے۔ تحفۂ درویش کی رسم ادا نہ ہو سکی۔ اسلئے کہ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ دشمن کا دوست اپنا دشمن۔ اور اُس دشمن پر لعنت جو غیبت میں چیں چیں کرکے سامنے دُم ہلائے۔ رہا مرتد ہونے کا سوال تو میاں سُن لو،

آئینۂ فطرت ہے یہ میری ہستی ۔ انسان کو انسان نظر آتا ہوں
حیوان کو حیوان نظر آتا ہوں ۔ شیطان کو شیطان نظر آتا ہوں

برادرانِ گرامی! مغرب کا وقت ہو چکا ہے۔ ہمیں نماز کی اجازت دیجئے اور اتنی دیر آپ ریڈیو پر "پیغامِ اقبال کلامِ اقبال کی اساس" پر سُنتے رہیئے کیونکہ ہم ٹھہرے رجعت پسند مسلمان اور آپ ہیں موڈرن اسلام کے فرزندِ اکبر۔ اللہ اکبر۔

عبدالوحید تسلیم

دھوپ چھاؤں

جولائی کا مہینہ تھا۔ گرمی خوب زوروں پر تھی۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے بہت بُرا حال تھا۔ لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔ لُو سے فصلیں کیا حیوان بھی جھلس رہے تھے۔۔۔۔ ایسے میں ایک دن شام کے وقت رحمت اپنے کھیتوں میں گیا۔ وہ بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ چہرے پر شگفتگی تھی۔ خوشی میں اُس نے دو تین شعر الاپے اور اپنی کھیتی کو جی بھر کر دیکھا۔ کھیت خوشنما اور سرسبز نظر آرہے تھے۔ لیکن اُن پر خاک پڑی دیکھ کر رحمت کچھ افسردہ سا ہوگیا۔ اور بارش کیلئے دعائیں مانگنے لگا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ دوسرے دن دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے کہ رحمت وہاں جا پہنچا۔ اور لوگوں کو اس طرح خوش گپیاں کرتے دیکھ کر کہا۔ "تمہیں خوش گپیوں کی سُوجھ رہی ہے؟" اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ دوسرے جھٹ بول اُٹھے "تو کیا کریں؟ یہاں بیٹھ کر روئیں!"۔۔۔ رحمت نے کہا۔

"افسوس ہے۔ تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ اگر میرا کہنا مانو تو آج ہی بارش ہوجائے۔ پھر لطف بھی آجائیگا ان باتوں کا۔ سب یک زبان ہو کر پوچھا "کیا بات ہے؟" رحمت نے کہا۔ "تم سب میرے ساتھ چلو میں تمہیں بتاتا ہوں۔" سب اُٹھ کر رحمت کے ساتھ ہولئے۔۔۔۔ رحمت ان سب کو لیکر دُور۔ بڑے بڑے ریت کے ٹیلوں پر گرم چلچلاتی دھوپ میں گیا۔ سب کے پسینے بہ نکلے۔ جب سب وہاں پہنچے تو کہا۔ "جلدی کرو اور ہمیں بتاؤ کہ کیا بات ہے؟ ارے رحمت! مرے ہم تو گرمی اور پیاس سے۔" رحمت نے جواب دیا۔ "ذرا صبر سے کام لو۔" اور ان سب کو کہا۔ "تم ذرا تمام کے تمام صف بنالو اور قبلہ کیطرف منہ کر کے کھڑے ہوجاؤ۔ میں امام بنتا ہوں۔" رحمت نے پہلے کبھی بھُولے سے بھی نماز نہ پڑھی تھی۔ لیکن آج اُسکے دل میں خدا جانے کہاں سے یہ خیال آگیا۔ ہاں، تو رحمت امام بنا اور سب اسکے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوگئے۔ خشک اور تپتی ہوئی ریت اور چلچلاتی دھوپ میں سب کے پاؤں جلنے لگے۔ لیکن وہ ڈٹے رہے۔

رحمت نے "اللہ اکبر" ہی کہا تھا کہ مشرق سے کالے کالے بادل مست ہاتھیوں کی مانند جھومتے اُٹھے اور آن کی آن میں آسمان پر چھا گئے۔ رحمت نے نماز ختم بھی نہ کی تھی کہ چھما چھم پانی پڑنے لگا۔ رحمت نے سلام پھیرا اور آسمان کیطرف دیکھا تو دیوانہ وار چلّا اٹھا۔ "اے خدایا تیرا شکر ہم عاجز کیسے ادا کرسکتے ہیں۔ بارش تیز ہوگئی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کیطرف لپکے۔ لیکن بارش اتنی شدید تھی کہ انہیں راستے ہی میں درختوں اور جھاڑیوں میں پناہ لینی پڑی۔ لوگ بڑے خوش تھے کہ آج کافی عرصہ بعد بارش ہوئی ہے۔ لوگوں کی اور زمین کی حسرت آج پوری ہوئی۔ کھیت سرسبز اور ہر ایک چیز دُھلی ہوئی نظر آنے لگی۔ آج لوگوں پر خدا مہربان تھا۔ ننھے ننھے بچے باہر کھیلنے کیلئے نکل گئے۔ کہیں کبڈی ہو رہی ہے۔ کہیں آنکھ مچولی۔ کہیں گلی ڈنڈا ہو رہا ہے۔ بستی کے لوگ بیحد مسرور ہیں۔ رحمت خوش ہو ہو کر ہر ایک سے کہتا۔ "دیکھا ہماری دعا کا اثر؟ کیسی بارش ہوئی ہے"۔ رحمت کی بیوی اور ایک لڑکا بھی اُسکی غربت کے شریک تھے۔ لڑکے کا نام ارشد تھا۔ سب اُسے پیار سے اچھّو کہتے۔ رحمت گھر آیا تو بیوی سے بولا۔ "کڑھائی چڑھائیے۔ دیکھو خداوند تعالیٰ نے آج کیسی مہربانی کی ہے۔ ہاں! اچھّو ذرا ادھر تو آ۔ لے مجھے حقہ بھر دے۔" اچھّو حقہ اٹھا کر نالی پر جا رہا تھا کہ راستے میں کسی اینٹ سے پاؤں جو ٹکرایا تو دھم سے نیچے آرہا۔ اُسکے گرتے ہی حقہ بھی زمین پر پٹخنی کھا گیا۔ حقہ جو گرا تو آگ پاس ہی پڑے ہوئے گھاس پھوس پر پڑ گئی۔ اچھّو بغیر دھیان دیئے حقہ اُٹھا کر چل دیا۔ شام کا وقت تھا کسی نے خیال نہ کیا اور آگ نے سلگتے سلگتے رحمت کے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چاروں طرف سے لوگ دوڑے آگ آگ۔ دوڑو دوڑو کا شور مچا۔ لیکن آگ اتنا زور پکڑ چکی تھی کہ لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی مکان جل کر راکھ ہوچکا تھا۔ رحمت سر پکڑے رو رہا تھا۔ لوگ اُسے تسلّی دے رہے تھے۔ لیکن رحمت سوچ رہا تھا کہ پچھلے سال تو فصل بوئی تھی وہ اتنی ہوئی تھی کہ میں سمجھتا تھا ہماری حالت بہتر ہوجائیگی۔ لیکن ٹڈی نے مجھے اُس خواب سے چونکا دیا۔ ٹڈی آن کی آن میں کھیت چاٹ گئی۔ نہ کوئی فصل نہ کوئی درخت! رہ گئی تنگدستی سر پر سوار۔ ہائے قسمت! اس سال یہ رہا سہا مکان بھی جل گیا۔ اس کی ساری جائیداد ضائع ہوچکی تھی۔ آج وہ بہت اُداس تھا۔ غمگین تھا۔ لیکن لوگ خوش تھے اور گیت گائے جا رہے تھے۔ جھولے جھول رہی تھیں لڑکیاں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کھیتوں کیطرف چلا جا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کاش! وہ بھی ان لوگوں کی طرح خوش ہوسکتا۔۔۔ کھیتوں پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور واپس آگیا۔ اب اسکی زندگی کا سہارا یہی کھیت تھے۔

دوسرے دن رحمت ہل چلا کر گھر واپس آیا۔ اور کھانا کھا کر سستانے کو تھا کہ آسمان پر جو نگاہ کی تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ ٹڈی دل کے دل چلے آرہے تھے۔ اپنی بیوی اور بچے کو لیکر کھیت کی طرف بھاگا۔۔۔۔ ہر طرف شور و غل بپا تھا۔ مختلف قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ کوئی ٹین بجا رہا تھا۔ کوئی ڈھول پیٹ رہا تھا اور کوئی بیلوں کے گھنگھرو اتار کر دوڑا پھر رہا تھا۔

(باقی صفحہ ۹)

حرفِ آخر

رشید قیصرانی :-

رشید قیصرانی ہمارے کالج کے نوجوان شاعر تھے۔ ان کے کلام میں پختگی اور کہنگی نمایاں نہیں ہے۔ لیکن بہ اندازِ فکر اور بلندئ خیال پتہ دیتی ہیں کہ وہ اپنے وقت کے اچھے شاعر ثابت ہونگے۔ رشید میں فطری شاعری کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ مشقِ سخن تیز کر دیں۔ تو ان کے جوہر فوراً ابھر آئیں گے۔ اُن کے کلام میں جذبات بھی ہوتے ہیں اور تاثیر بھی۔ الفاظ کی ترکیبیں اور نشست و برخاست کو ذرا اور چُست کر دیا جائے تو اُن میں جوش کی لہریں سر مارتی ہوئی نظر آنے لگیں گی۔

رشید قیصرانی کی قومی نظمیں پُرسوز ہیں۔ ان میں شاعر کے احساس کی کسک بھی پائی جاتی ہے۔ نئی تشبیہات کا استعمال وہ جا بجا کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان کا پاؤں بھی پھسلتا ہے۔ بہرحال نو آموزی اس کا سبب ہے، عدم علم اس کا موجب نہیں۔ طنز اور تشبیہ کا اچھوتا پن ملاحظہ فرمائیے ؎

نوکِ سنگین پہ جب ہوتا ہے مظلوم کا سر ٭ تم اُسے سُرخ پھریرے کا لقب دیتے ہو

بڑا بھرپور وار ہے۔ اور رشید کا اندازِ کلام اس مرحلہ پر کامیاب ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکر کو الفاظ کا لباس پہناتے وقت اُنہیں یہ خیال رہتا ہے کہ ناقص زبان شاعر کے خیال اور احساس کی وضاحت میں روک ڈالتی ہے۔ لیکن اُنہیں خود زبان پر قدرت اور دسترس نہیں ہے۔ اور وہ اس جانب زیادہ متوجہ ہوں تو فی الحقیقت بہتر ہوگا۔ ردیف و قافیہ کا انتخاب، صوتی ہم آہنگی اور مترنم بحریں وہ اچھی تراشتے ہیں۔

رشید کے سمندِ سخن میں بے باک اور نڈر دل ہے۔ اور اگر وہ اُسے مہمیز کرتے رہے۔ تو وہ دن دُور نہیں کہ یہ اسپِ تازی زقند لگائیگا اور تاروں پر کمندیں ڈال دے گا۔

بہرکیف رشید فطری شاعر ہیں۔ اور اگر انہیں صحیح راہنمائی میسر آجائے۔ تو وہ پختہ گو اور مشاق شاعر بھی بن سکتے ہیں۔

عبدالواسع عمر :-

ادب میں مزاح کو وہی حیثیت حاصل ہے، جو تندرست جسم میں روح کو یا انسانی زندگی میں خود ادب کو۔ ہم اردو ادب میں مزاح کی دونوں اقسام موجود پاتے ہیں۔ مزاحِ لطیف اور مزاحِ کثیف، مزاحِ کثیف میں قہقہوں کی بھرمار ہے۔ لیکن مزاحِ لطیف میں خفیف ہنسی کے علاوہ انفرادی اور قومی خامیوں پر ایک ہلکی طنز موجود ہوتی ہے۔ طنز سے مراد ایسی تنقید ہے جس سے ایک قسم کی چبھن محسوس ہو۔ واسع صاحب ایک اچھے مزاح نگار ہیں۔ ہمارے طلبہ میں ان کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

اُن کے مزاح میں لطافت کے علاوہ کثافت کے بھی نشانات پائے جاتے ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر شستہ مگر ظرافت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُن کے ہاں ذہانت کا ثبوت ہر جگہ نمایاں ہے۔ بات سے بات نکالنا ان کا وصف ہے۔ آپ رمز و کنایہ میں تنقید کے دشوار گذار مراحل طے کر لیتے ہیں۔ خیالات کی دُور رس گہرائی اور نزاکت عام مذاق سے علیحدہ ہوتی ہے۔ انکی تحریر تکلف اور آورد سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص دلکشی کی حامل ہے۔

آپ بہت کم لکھتے ہیں۔ لیکن جو کچھ بھی لکھتے ہیں۔ ایک لمبے عرصہ تک دماغ پر اس کے تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ہم خلوت و جلوت میں اُن کے شگفتہ فقرات کو دُہرا کر حظ اٹھاتے ہیں۔

مصلح الدین بنگالی :-

استاد میر تقی میرؔ دہلوی کے کلام میں جو درد، سوز، کرب، یاس، آہ اور قنوطیت ہے، اگر چلتی پھرتی عکاسی متصوّر ہو۔

تو ان اجزائے ترکیبی کا ایک دھندلا سا خاکہ مصلح الدین کی یاد تازہ کرنے کو کافی ہے۔ مصلح ہمارے کالج کا ہونہار نوجوان ہے نثر نگاری میں اس نے ایک ڈھب نکالی تھی۔ مگر قلم قنوطیت میں پھنس گیا اور قلمی زندگی میں خشک گذار اور حوادثِ عالم کے پیدا کردہ تفکرش زیادہ نمایاں ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غالباً مسلسل اور زیادہ لکھنے سے قاصر رہا ہے۔ گداز تاثر کی جان ہے۔ لیکن داخلی بیتابی اگر خارجی محسوسات کو بھی دیکھ سکے تو پھر ایسی تحریر انقلابی تحریر ہوتی ہے۔

مصلح بولے تو ہشاش بشاش اور خاصہ چونچال نظر آئیگا۔ خاموش رہے تو زاہد خشک اور تارک الدنیا سا آدمی۔ لیکن جب نثر نگاری کرتا ہے تو یہی مصلح مقلد میر معلوم ہونے لگتا ہے۔

ہمارا آج کا ادیب عملی دنیا میں بہت زبوں ہے۔ لیکن "مصلح نثر نگار" عملی زندگی میں بھی کامیاب ہے۔ کیونکہ نماز روزہ کی پابندی اور اجتماعی زندگی میں نظام کی تقلید و احترام اس کا شعار ہے۔

قائدِ ملت خان لیاقت علی خاں کا سانحۂ قتل :-

حرفِ آخر کو ترتیب دیتے ہوئے جب ہم اس مرحلہ پر پہنچے۔ تو خبر ملی کہ قائدِ ملت خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کسی بزدل اور سفاک دشمن کے ہاتھوں راولپنڈی میں جب آپ مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے شہید کر دیئے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ملتِ اسلامیہ کے لئے بالعموم اور ملتِ پاکستان کے لئے بالخصوص یہ سانحہ بڑے ہی صبر اور امتحان کا ہے۔ کیونکہ خان لیاقت علی خاں کے وجود میں مسلمان قوم کا ایک بہت بڑا ہمدرد اُٹھ گیا۔

آپ نے دُنیا کے امن کو برقرار رکھنے کے لئے گذشتہ چند سال میں جو کوششیں کی ہیں، وہ دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ملت کو اس آزمائش کا مقابلہ کرنے کی توفیق دے۔ آمین

اِس سانحۂ قتل پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے کالج کے سٹاف اور طلباء نے ایک ہنگامی اجلاس میں حسب ذیل قرار داد تعزیت پاس کی۔ ادارہ المنار بھی ان پر خلوص جذبات کے اظہار میں کالج سٹاف اور طلباء کا ہمنوا ہے:-

"تعلیم الاسلام کالج کے سٹاف اور طلباء کا یہ ہنگامی اجلاس عزت مآب لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان و صدر پاکستان مسلم لیگ کے اندوہناک سانحۂ قتل پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ہمارے محبوب وزیر اعظم کا یہ قتل پاکستان ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے نقصان عظیم ہے۔ اپنی شجاعت و تحمل، پُرسکون قوتِ فیصلہ، کامیاب قیادت، پختہ ارادے اور آہنی عزم کی وجہ سے وزیر اعظم لیاقت علی خان بجا طور پر دنیا کے چوٹی کے سیاستدانوں میں شمار ہوتے تھے۔ پاکستان اپنی زندگی کے نازک ترین دور میں سے گذر رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر ہنوز تصفیہ طلب ہے۔ اور دشمن کی فوجیں بد ارادوں سے ہماری سرحدوں پر جمع ہیں۔ عالم اسلامی کی الجھنیں بڑھ رہی ہیں۔ اور جنگ کے بادل افقِ عالم پر منڈلا رہے ہیں۔ ایسے نازک وقت میں اس حادثہ کے دُور رس نتائج کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں۔ پس ہمیں اپنے اندرونی اور بیرونی خطرات سے خبردار رہتے ہوئے قائدِ اعظم کے دیئے ہوئے، اور لیاقت علی خان وزیر اعظم کے اپنائے ہوئے اصولوں یعنی اتحاد، یقین اور نظم پر مضبوطی سے قائم ہو جانا چاہیئے۔ کہ اسی میں ہماری قومی بقا ہے۔ خدا ہمارا مددگار ہو۔

لیاقت علی خاں زندہ باد، پاکستان پائندہ باد"

یہ اجلاس بیگم لیاقت علی خاں اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

Almanar

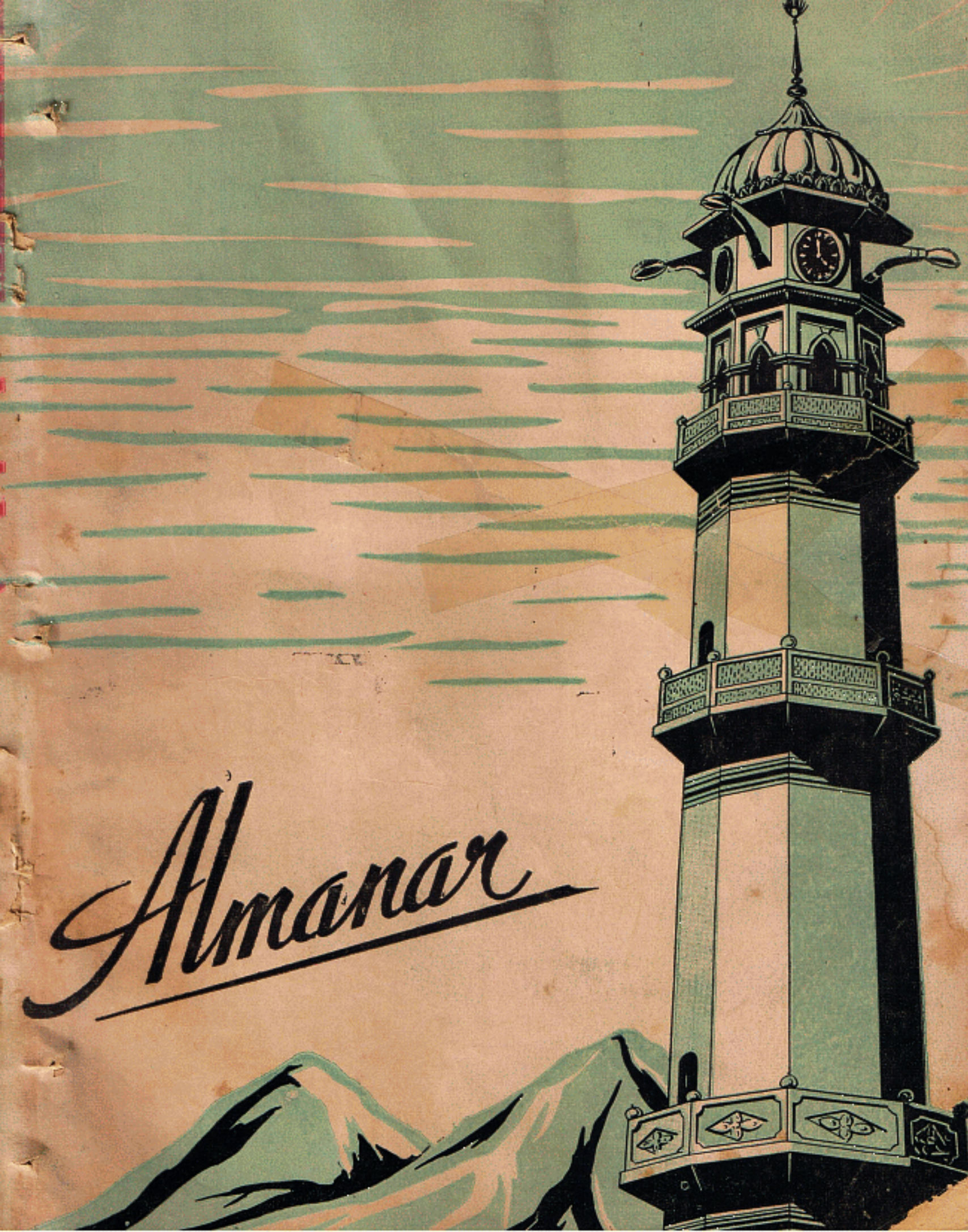

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

MAGAZINE

October - December 1951

○

Professor - in - Charge

Mohammad Ali Chaudhri, M. A.

Editors

Naeem Ahmad

Mirza Khurshid Ahmad

Assistant Editor

Syed Nasir Ahmad

Contents

Vol. Two No. 3

Verse from the Holy Quran	...		3
Obituary	...	...	5
A Short Sketch of Muslim History	...	Prof. Abdus Salam	6
The Clever Hormuzan	...	Sufi Abdul Aziz	10
Through the Kurram Valley	...	Basharat-ur-Rahman, M. A.	11
Through Thick and Thin	...	Khan L. Mannan Sabir	13
Advertisement	...	Mohammad Shafiq	15
What is in a Name	...	Nur-ud-Din Amjad	17

d t Insha Press, Urdu Bazar, Lahore and Published by A. R. Junaid
for the T. I. College, Lahore

ولنبلونكم بشى من الخوف و الجوع و نقص من

الاموال و الانفس و الثمــرات و بشرالصبــرين.

الذين اذآ اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانااليه راجعون

And We will try you with something of fear and hunger, and loss of wealth and lives, and fruits; but give glad tidings to the patient.

Who, when a misfortune overtakes them, say, 'Surely to Allah we belong and to Him shall we return.'

OBITUARY

This emergent meeting of the staff and students of Talim-ul-Islam College, Lahore places on record its deep feelings of grief and shock at the dastardly assassination of the Hon'ble Liaqat Ali Khan, Prime Minister of Pakistan and President, All Pakistan Muslim League.

The loss suffered at the ungrateful hands of the assassin is both national and international. With his calm courage, balanced judgment, rocklike determination and robust leadership, he had justly come to be recognized as by far the most leading Statesman of Asia. With the Kashmir problem hanging fire, hostile forces ranged along the borders, the entire Muslim World facing an unparallelled crisis, and the grim shadows of a total war looming large against international horizon, the implications of the loss are too appalling to contemplate. Let this tragedy serve as an eye-opener to the Nation and warn us against dangers both internal and external, and help close up our ranks as never before.

This meeting extends its heartfelt sympathies to the Begum and other relatives of the deceased in the heavy bereavement and prays that God may grant them strength to bear it in the true Islamic Spirit.

Prof. Abdus Salam

A SHORT SKETCH OF MUSLIM HISTORY

IN this paper I shall try to sketch an outline of Islam's political history, and show the glorious faith preached by the Holy Prophet spread out of the confines of Arabia to the farthest corners of the world. I shall also try to give an outline history of all the present day independent Muslim countries. It shall necessarily be a very short sketch but I hope it shall give some idea of what power Islam once was and God willing, shall once again be through Ahmadiyyat, the true Islam.

FIVE PERIODS

Islamic history may conveniently be divided into five periods :—

1. The first period may be called The Arab Period. This comprises the times of (*a*) the first four Caliphs of Islam ; (*b*) the Omayyads at Damascus ; (*c*) and the Abbasids at Baghdad.

The first period runs from 632 A.D. to 950 A.D. approximately. During this period the centralism of Islam was intact and the Caliph was both the spiritual and the temproal head of Islamic world. It was immediately followed by a hundred years of divided principalities when the Caliph's temporal power was reduced to naught. It appeared as if Islam's political power would entirely disintegrate.

2. But about 1050 A. D. a new people appeared on the scene—the Saljuqs. They accepted Islam and under them for approximately two hundred years more, the centralism of Islam was restored. Thus our second period that of the Saljuqs comes to a close round about 1250 A.D.

3. The third period begins with the Mongol onslaught in 1258 when Baghdad was sacked, the Caliph killed, and lands of Islam entirely ruined. But in 20 years the Mongols themselves had accepted Islam. Their period including that of Timurlane extends till about 1500 A. D.

4. From 1500 we enter the fourth period, that of Safvis in Persia, Osmani Turks in Turkey, and the Great Moghals in India—the period of national and regional dynasties.

5. Finally, the period starting from about 1700 A. D. brings us to the present day. In this period European powers began playing their role in the world of Islam.

With this introduction we shall now go on to a detailed consideration of the periods I have mentioned.

PERIOD OF THE CALIPHATE

At the death of the Holy Prophet of Islam (peace be on him) in 632 A. D. practically the whole of Arabia proper had accepted Islam. Under his first duly elected successor, the Caliph Abu Bakr, the power of Islam was consolidated still further in Arabia.

But it was during the time of the second successor, Hazrat Omar, that Islam spread outside Arabia and won its most glorious victories. The Byzantines and

the Persians both thought Arabia belonged to them and construing the rise of Islam as a rebellion against them hastened to march to chastise the Arabs. Handful of Muslims faced numbers, in some cases in the ratio of one man to ten, but the fierzeal of the faith swept all before it. Damascus fell to the arms of Islam in 635, Yarmuk in 636 and with it Syria. The fate of Persia was decided at Qadisyia in 637 and Egypt was conquered in 640. But the reign of Caliph Omar was not memorable only on account of its military glory. It was in his reign that for the first time in the world history the principle was recognized that the State was responsible for the material welfare of all its citizens. It was recognized that State had more obligations than rights. The saying with which he began his reign will never be antiquated :

'By Allah, he that is the weakest among you shall be in my sight the strongest for I shall vindicate for him his rights, but him that is the strongest will I treat as the weakest until he complies with the law."

After Omar succeeded Osman and Ali. After Ali the principle of election of the caliph died out. Muaviya who succeeded him in 661, as Caliph made Caliphate hereditary and Omayyad dynasty began.

The question of succesion of the Prophet raised the greatest political problem that Islam has had to face. The Shias contended that after the Prophet, Hazrat Ali should have succeeded the Prophet though he never himself laid any claims to caliphate on the score of blood relationship. Actually, it were the Persians to whom Divine Right was more or less a sacred article of faith, who were the greatest champions of Ali's family. All through Muslim history this difference between Shias and Sunnis has persisted.

Returning to the Omayyads ; during the period of Muaviya's successor Yazid in 680 happened the battle of Karbala. Hazrat Ali's son Hazrat Hussain declined to pay homage to a Caliph who had not been elected in a Shura. He was martyred on the plains of Karbala.

Among the Omayyad Caliphs Walid I was the most glorious. In his reign in 711 A D. a handful of Muslims under Tariq crossed over into Spain. In a few years they had overrun it with irresistable force and for the next 700 years Spain was a Muslim country. During this period Mohammad bin Qasim invaded India and conquered Sindh and Multan.

THE ABBASIDS

The Omayyads fell in 750 A. D. and were succeeded by the Abbasids, who though Sunnis in faith came to power with the help of Khurasani Shias. The Abbasids transferred their seat of Government from Damascus to Baghdad. The most glorious reign among the Abbasid was doubtless that of Haroon-ur-Rashid, the hero of the celebrated Arabian Nights and his son Mamoon. Islamic learning and the prosperity of the Muslim countries were at a pitch that had never been reached before.

About hundred years after Haroon's death the power of the Abbasid Caliphs began to wane. In Khurasan Samanids took over power, in Fars Buyids, in Messopoetemia the Hamadanis, in Africa the Fatmids and in Arabia the Carmathians. All these rulers acknowledged (except the

but about 1220 occurred one of the greatest eruptions in the history of the world. The nomadic tribes of Central Asia—the Mongols—swarmed over the whole civilized world, (both Europe and Asia) and under Chengiz Khan and Halagu Khan swept like an avalanche all before them. About 1260 it appeared that Islam's political power had disappeared for good; Baghdad had been razed to the ground; the Calphate obliterated; the lands of Islam, Persia, Transoxonia and Iraq laid completely waste.

But then again the miracle happened. The religion of the conquered conquered conquerors. I shall briefly recount the story of the Mongols here. Why the Mongols rose like that, nobody has finally ascertained. "In its suddenness, its devastating destruction, its appalling ferocity its passionless and purposeless cruelty, its irresistible though shortlived violence, the Mongol onslaught resembles some brute cataclysm of the blind forces of nature rather than a phenomenon of human history."

About 1220 they fell on the lands of Islam and Europe. In Europe they sacked Moscow, Rostov, Kiev and Cracow. Their second wave in 1258, under Halagu obliterated Baghdad and the Islamic Caliphate. It seemed they came merely to kill and ruin. One by one all the Muslim countries fell before their onslaught. They did not excell in courage—if they spared the inhabitants of a town which surrendered, it was either to profit by their skill or to emlpoy them against their countrymen. 'Dozens of wretched captives accompanied the advancing hordes, erected the engines of the besiegers, they were driven to the breaches effected in the walls to fill with their bodies moat and trench, and were finally, if they still escaped death put to the sword to give place to a new batch of victims drawn from fresh conquests. Their cruelty was calculated, and deliberately designed to strike with a paralysis of terror those whom they proposed next to attack while they left behind them reeking ruins and channel houses."

That nothing might be left to complete the ruin of their victims they retired from a town which they had sacked, sent a detachment to revisit its ruins and kill such wretches as had emerged from their hiding places. The extent of terror they aroused can be judged from the following quotation from *Ibn ul-Athir* (written in 1230):

"I have heard that one of them took a man captive but had not with him any weapon wherewith to kill him and he said to his prisoner, 'Lay your head on the ground and do not move' and he did so and the Tatar went and fetched his sword and slew him therewith."

They professed no religion but their destruction of the centres of Islamic civilization advanced them so much in favour of the Pope that His Holiness was pleased to write to Ogati Khan and others, letters under his own signature. The Pope realized their perfidy only when their hordes began devastating the Christian lands with equal impartiality!

In the annals of Islam there has been

(Continued on Page 14)

The Clever Hormuzan

1. Hormuzan was a vigilant cheat,
   Cunning, clever and deceitful, too,
   He always played the people fraud,
   In WORD and DEED he was nev'r true.

2. He was a great Iranian chief ;
   Islam, our religion, he did hate ;
   He fought against our brethren oft ;
   In embarrassing them he was never late.

3. And when in the battle of Kadisiya,
   Our valiant heroes won the day,
   Lo ! Hormuzan — our dexterous foe—
   Through cleverness he fled away.

4. But when he was pursued and caught,
   To the Muslim general he, then, said—
   " I do implore thee, my good sire !
   To send me unto y'or sovereign head."

5. And when in the presence of the Caliph he stood,
   The Caliph OMAR—so strong, so great
   Thus spake, " Well Hormuzan ! Be quick.
   And say what ye need ; I can scarce wait."

6. " A cup of water" said Hormuzan,
   And a cup was brought to him, full to the brim
   He held the cup and, then, besought
   The Caliph,— be God pleased with him,

7. —"I should not be slain, until !
   I have this water entirely drunk.
   Do grant me this boon, good Lord !
   And favo'r me like a magnanimous monk."

8. The Caliph agreed and Hormuzan dropped
   The cup and said,— " You can't slay me—
   I shall not drink this water, now spilt,
   Nor would your break your word. Would ye ?"

9. "Well Hormuzan ! you have cheated me.
   But I won't cheat you," the Caliph said ;
   "I am bound to honour my word,
   To the rules of Islam we are wed."

10. It illumined the heart of Hormuzan,
    Islam he, forthwith, did embrace.
    " No god but HE." he, 'loud proclaimed,
    Then glistened his eyes and glittered his face.

Basharat-ur-Rahman, M. A.

Through the Kurram Valley

DURING the last Summar Vacation I visited Para-Chinar, the Headquarters of the Kurram Agency. I often accompanied my brother Mirza Maqsood Ahmad S. D. O. in his extensive rounds through the valley and thus had an ample opportunity of seeing for myself the various aspects and features of this far-flung border area of Pakistan.

The valley starts from Thal which is the extreme end of the Kohat District of the N. W. F. P. Thal is 61 Miles away from Kohat and Para-Chinar is 56 Miles farther off from Thal.

All these stations are connected by means of a very good metalled road; a narrow gauge railway line also runs between Kohat and Thal. Thal lies very near the borders of North Waziristan and the Khost province of Afghanistan; the Kurram valley lies to its west. It is the meeting place for the people of Khost, North Waziristan and the Kurram. In 1919, when the Ex-King of Afghanistan, Amir Amanullah Khan invaded the British India, Thal was easily invested by General Nadir Khan. After that, the British made very elaborate arrangements for its security. Now fortifications and other security arrangements can be seen spreading all along the Kurram river.

PEOPLE

The Kurram valley is mainly inhabited by Turi Pathans who are Shias by faith. They are leading a semi-independent life. It is generally said that the aim of a Turi is to marry the woman he loves, to murder the enemy he hates, to collect money by corruption and then to wash off his sins by a pilgrimage to Karbala. Marriage expenditure, among these people is very high. The cost of a bride varies from Rs. 1,000 to Rs. 3,000 (Kabuli) and other expenses are from Rs. 500 to Rs. 1,000.

FOOD

Their food is deficient and Boiled rice with some pulses in it or wheat bread with tea and a little fresh fruit make up the menu. Meat is expensive and not easily obtainable. Vegetables and pulses do not enter their diet. Generally It is not considered dignified for a Pathan to eat them.

HEALTH

From the health point of view, the valley can be divided into the river basin of the Upper and Lower Kurram and the hilly country on both sides of the river basin.

Rice and cultivation in the former has resulted in Malaria with disastrous effects on the general health of the people. The inhabitants of the surrounding hills are virile. The most common disease among the tribesmen in the hills, is Syphilis. Intestinal worms are another common

disease but in this case God has been kind in providing remedy on the spot in the form of a herb called artemisia, containing santonin.

Now-a-days artemisia is very extensively cultivated in the valley under the supervision and patronage of the Agriculture Department of the N. W. F. P. and a very much lucrative business has developed, bringing an annual profit of 25 lakhs of rupees. 90 % of the world supply of santonin comes from the Kurram. In the villages, daysentry is very common, on account of unsatifactory water supply. The health of Para-Chinar, (the Headquarters of the valley) has been improved by new measures.

PARA-CHINAR

It has got its own water and electric supplies. It has got a population of about 3,500 and a flourishing trade with Afghanistan. The roads are very clean and tidy. In Summer, it has got a temperate calimate and sufficient rains; and this makes it a fine health resort. It has got telephone and telegraph connections with other cities in the settled districts. It is also the Headquarters of the local Kurram Militia, which is the only garrison posted to protect the valley. I still remember witnessing of a foot-ball match played between the Kurram Militia and the Bazar team. Thousands of the tribesmen had come to see the match. During the course of the match, a quarrel arose between the two teams and the bazar team walked out. After this, all the tribesmen rushed into the field and staged a folk-dance. They grouped themselves into long files, sang and danced, making wild gestures and movements with their hands and heads.

The Kurram is very closely connected with the political revolutions in Afghanistan. In February 1928, a serious burglary was committed in the bazar of Para-Chinar, when a safe containing Rs. 6,000 was stolen from a shop. It was found that the culprits were, a man named Habibullah, better known as "Bacha-i-Saqqao," and his brother. After this he made the best of the disturbed conditions in Afghanistan and became a daring raider. Later he overthrew King Amanullah Khan. In January 1929, he proclaimed himself Amir of the Afghan people and King Amanullah Khan had to leave the country bag and baggage. On the 8th of March Sardar Nadir Khan who had hurriedly returned from France stayed a night at Para-Chinar with Mr. Maconachie, Political Agent, Kurram and held discussions with him. Nadir Khan then entered Khost and after very hard fighting captured Bacha-i-Saqqao who was at-once executed. Sardar Nadir Khan now became Nadir Shah, the Shah of Afghanistan. He proved himself to be a very beneficent ruler and everybody was pleased with his benign and enlightened administration. He, however, fell to an assassin's bullet in 1933, thus fulfilling the famous revelation of the Promised Messiah (May peace be upon him).

"آ، نادر شاہ کہاں گیا"

Every Muslim felt a sense of deep and personal loss at this assassination and the words of God's Revelation mentioned above, were echoed from every heart.

Now, some more stray facts about the Kurram valley:

The scenery of the valley with the

(Continued on Page 16)

disease but in this case God has been kind in providing remedy on the spot in the form of a herb called artemisia, containing santonin.

Now-a-days artemisia is very extensively cultivated in the valley under the supervision and patronage of the Agriculture Depattment of the N. W. F. P. and a very much lucrative business has developed, bringing an annual profit of 25 lakhs of rupees. 90 % of the world supply of santonin comes from the Kurram. In the villages, daysentry is very common, on account of unsatifactory water supply. The health of Para-Chinar, (the Headquarters of the valley) has been improved by new measures.

PARA-CHINAR

It has got its own water and electric supplies. It has got a population of about 3,500 and a flourishing trade with Afghanistan. The roads are very clean and tidy. In Summer, it has got a temperate calimate and sufficient rains; and this makes it a fine health resort. It has got telephone and telegraph connections with other cities in the settled districts. It is also the Headquarters of the local Kurram Militia, which is the only garrison posted to protect the valley. I still remember witnessing of a foor-ball match played between the Kurram Militia and the Bazar team. Thousands of the tribesmen had come to see the match. During the course of the match, a quarrel arose between the two teams and the bazar team walked out. After this, all the tribesmen rushed into the field and staged a folk-dance. They grouped themselves into long files, sang and danced, making wild gestures and movements with their hands and heads.

The Kurram is very closely connected with the political revolutions in Afghanistan. In February 1928, a serious burglary was committed in the bazar of Para-Chinar, when a safe containing Rs. 6,000 was stolen from a shop. It was found that the culprits were, a man named Habibullah, better known as "Bacha-i-Saqqao," and his brother. After this he made the best of the disturbed conditions in Afghanistan and became a daring raider. Later he overthrew King Amanullah Khan. In January 1929, he proclaimed himself Amir of the Afghan people and King Amanullah Khan had to leave the country bag and baggage. On the 8th of March Sardar Nadir Khan who had hurriedly returned from France stayed a night at Para-Chinar with Mr. Maconachie, Political Agent, Kurram and held discussions with him. Nadir Khan then entered Khost and after very hard fighting captured Bacha-i-Saqqao who was at-once executed. Sardar Nadir Khan now became Nadir Shah, the Shah of Afghanistan. He proved himself to be a very beneficent ruler and everybody was pleased with his benign and enlightened administration. He, however, fell to an assassin's bullet in 1933, thus fulfilling the famous revelation of the Promised Messiah (May peace be upon him).

"آہ نادر شاہ کہاں گیا"

Every Muslim felt a sense of deep and personal loss at this assassination and the words of God's Revelation mentioned above, were echoed from every heart.

Now, some more stray facts about the Kurram valley:

The scenery of the valley with the

(Continued on Page 16)

Khan L. Mannan Sabir

Through Thick and Thin

LET it not be taken as an attack against the race of Sir Falstaff. Their Fat Heavinesses can sit back in wide heavy chairs with equanimity, perfectly safe and at peace with the world. The fat enjoy the inherent right of being accepted as respectable and dignified. A stranger approaching a group of people would by instinct address the fattest person in the party. Obesity makes for dignity, particularly in the East. In fact it is almost rare and certainly difficult to find a thin person claiming greatness and being accepted as great. The Qaid-i-Azam is an exception. It sometimes appears that the heavy people are somehow responsible for maintaining the balance and equilibrium of the world, just as the anchor keeps the ship on an even keel. Cynics might point out that it is an over statement. How could they maintain the balance of the world, when they can hardly maintain their own balance, but the thick dignity and calm placidity of the followers of Fallstaff is not disturbed by the just or unjust sallies of the cynics. It is quite another thing that they have rather upset the present economic balance of the world. The thin people in their bilious moments might retort that the food shortages are due to only one cause, namely the fat people, the gluttons.

A fat person is never angry. He is at peace with the world. He does only two things. He either eats and drinks or he sleeps and snores and thus drowns the worries and cares of the world, in the loud bass of his snores. When he laughs he dosn't merely smile. He laughs with a will, vehemence and vengeance. He laughs with the whole of his body, particularly with the belly. In fact, laughter and fatness have very positive correlation. You will never find a thin hungry looking individual having a hearty laugh.

Shakespeare's Sir Charles Falstaff enjoys life and food. When the time comes for paying its bills, he can't put his hands in his trousers pocket. He is so fat. He employed thin people for doing this job for him. With a flourish of the hand, he would ask his page, "Boy see what money is in my pocket." A thin person cannot enjoy this blissful ignorance about the size and contents of his pocket.

The fat people through the sheer weight of their personalities dictate terms to the thin people. Dr. Johnson the famous literary dictator couldn't have reigned as he did, if he were thin.

And they enjoy every bit of their travels. They get their money's worth ten times over It is not difficult and unusual to find the members of this species occupying four seats instead of the one to which they have the title. True, they do face certain awkward situations sometimes. For intance they can't travel single in a tonga They must on such occasions employ a fat servant to keep and help restore the balance of the

tonga, weight for weight. They can't board all the buses and if they do, it is difficult to get out. They have to spend more on clothes and shoes, particularly shoes. The suit of a fat man could cloth a family. And God help if the wife is equally fat. The two between them could bring about a regular famine in clothes. Whenever they go on a visit a number of the chairs and cots of the host are certain casualties. And unfortunately it is usually impossible for him to borrow clothes. There is another snag in being fat. A fat person must never be short statured. With the centre of gravity very low he can't walk. He simply rolls and it is usually difficult to find out, which way he is turning. All his facial features, arms and legs, disappear in a single mass of round flesh.

And he can't run. With his heavy tonnage it is rather hard for him, even to walk. How he pants like a steam engine ! And perspires in torrents. At games he can only watch. But he could however be a very good goal keeper. He physically blocks the goal and if the ball passes, it can only pass through him. Usually he dosn't go to the hills, but if he does he is to be hauled home in the evening. He cant go up. When he tries to go down he does it so quickly that it is difficult for him to arrest his downward sweep at crucial moments and he usually lands in a deep valley from where only cranes could take him out. He is like the famous Humpty Dumpty who was fond of sitting on the wall and had a great fall and not even the king's horses could put him together again. He is the sunlight that dispels the darkness of sorrow. Long live the fat people and prosperity to their bellies. They are the great benefactors of the human race.

★

(Continued from Page 9)

no event with the like import. The destruction of Baghdad as metropolis of Islam, its reduction to the status of a provincial town, and the murder of the Caliph, struck a fatal blow at the semblance of Unity which had subsisted among the nations of Islam. The sack of Baghdad lasted a week while 80,000 people were put to death. The loss suffered by Moslim learning which never again regained its pristine level defies description and almost surpasses imagination. Not only were thousands of priceless books annihilated, but also the very tradition of accurate scholarship and original research was almost destroyed. But inspite of all this they could not kill the religion of Islam. They themselves fell victims to it. About 1275 the Mongol rulers had accepted Islam. Thenceforward, those very Mongols were Islam's greatest champions.

★

Muhammad Shafiq

ADVERTISEMENT

ADVERTISEMENT as such is little different from misstatement, deliberate and loud. Only its various manifestations are named in a grand respectable style. It may be called propaganda, study circle, discussion group, rallies, meets, etc. But it is only very rarely that facts are allowed to speak for themselves. Lot of foreign meaning, prejudice, bias are imported. Instead of saying so many people died, it would be stated that so many huns were annihilated.

Advertisement is an art. It has almost been perfected in the modern times. Advertisement does not merely mean the advertisement columns in newspapers, handbills and life size posters. The phenomenon manifests itself in all departments of modern life. As a matter of fact modern life is synonymous with advertisement. The political parties in a country advertise their programmes or manifestos always before elections though rarely after elections because usually the promises are forgottan in the triumph of victory. They talk of the intended measures they want to take not for the sake of those measures but for the sake of attracting public attention and approbation and votes. If the British labour party is forced by circumstances to concede freedom to the Indo-Pakistan sub-continent, the fact is quoted and proclaimed from house tops to win votes for Labour.

At the radio, the announcer usually advertises his name before he begins the announcement. Name-plates at house doors including all the degrees and official distinctions are prominently displayed. Letter heads, visiting cards, etc., are all varieties of advertisement. In short modern world is largely advertisement. We are living in an age of utter exhibitionism. Take away advertisement and modern business and commerce would be no more. Take up the advertisement columns of a newspaper. We at once enter as were, a wonder-land, a regular Utopia. Every disease is curable here, sometimes by a single medicine. Only you have to try it. Medical science stands exploded by the advertisement of certain medicines which can cure all eye troubles except born blindness. Black colour can be bleached. The pigmy is raised into a giant. Bald heads are promised new crops of hair. Students are offered success and brainless people brains, if only they buy certain magic pills.

The quality of an article is determined not by its worth but by the quality of the advertisement which introduces it to to the public. The greater the noise and propaganda made about an article the more acceptable it is to the public. The fact is amply brought out by the emphasis laid on packing. It can be safely said that more money is spent on packing than it is done on contents.

Certain chemicals like scents, hair oils, and other cosmetics are packed in containers that could decorate a king's palace, in the 18th century. The contents are usually not very costly, and could be prepared by a simple formula without much inconvenience. It is said that a certain firm in Indo-Pak subcontinent invested one lakh of Rs. in a certain business enterprise. 99 thousand rupees were spent on advertisement and only one thousand Rs. on the medicine advertised. The result was an overwhelming success The gullible receptive public had already been prepared through advertisements that a great medicine was soon to appear on the horizon for the benefit of the afflicted. It did appear and the public accepted it on its face value. The East as usual has been surpassed and outclassed in this respect too. Daily newspaper's main income is derived from advertisements. The greatar the circulation of a paper the more the number of advertisements it carries. In America, for instance, the usual size of a daily newspaper is sixty pages, that of its weekly edition two hundred pages. It contains news, topical articles and specialised columns, but mostly it is composed of classified advertisements.

What baffles a man is how the modern people have succeeded in ignoring personal opinions and depending on the opinions of others, dished out and served through the advertisement columns of the modern newspaper

●

(Continued from Page 12)

river Kurram, winding its zigzag path throuh a narrow strip of fertile land, green with rich rice crops, is indeed very very beautiful. The river is the main water supply of the surrounding villages. Apple and pomegranate gardens are often seen here and there, especially in the part of the country around Para-Chinar. The valley is bordered in the west by the alpine peaks of Kohi-Safed, which constitute the Durand Line, the boundary between Pakistan and Afghanistan. Snow can be seen lying at certain places, in these lofty mountains even in the months of July and August. I, in company of my brother Mirza Maqsood Ahmad once tried to touch one of these snow spots but had to cut short our mountaineering programme as the evening was fast approaching and we were in the midst of the dangerous tribal territory. We met certain tribesmen and had a heart to heart talk with them One of the n was of the opinion that if I was left there and made to stay in their territory during the approaching winter, I would certainly shake off my ill health and minor ailments but to this Mirza Maqsood Ahmad would not agree. Nor I think would our worthy Principal agree to such a proposition, as there are multifarious other methods of restoring my ill-health. Especially the worthy Principal is always ready to meet all such situations with his soya-bean treamtent.

Nur-ud-Din Amjad

What is in a Name?

I respected that great Englishman called Shakespeare quite a lot before I knew that it was he who concocted the well-known saying 'What is in a name?'

Really it shocked me a great deal as I did not expect such a thing at least from Shakespeare and I have still a strong notion that this honourable name has been falsely attached to this saying. But now that the man is no more there is no contradicting this common belief.

"What is not in a name?" I say. Well, there is everything in a name. Otherwise if there is nothing in a name then how is it that the "christening" ceremony is held in high esteem all over the world.

Surely there is something which forms the basis of this age-honoured tradition.

A name is an indicator of many a thing. For example it shows the religion, which one belongs to, the followers of different religions have got different discriminating names of their own. If we know a name it is the least difficult thing to decide whether that person is a Muslim or a Hindu or something else.

Then names determine the place of origin of a man. Whenever we come across some Chatterji or Bannerji, we spontaneously decide that the gentleman is 'A Gentleman from Bengal' (not of France'). Similarly we know that Messers —Sky and—Oltov are Russians beyond doubt.

And sometimes these names betray the taste of the parents, as well. Parents who name their children as Allah Rakha or Khuda Baksh apparently belong to good old days. While those who name their babies as Nikhat Rathore and Ullah Karamat instead of (Karamatullah) are out and out Ultra-modern people.

Actually names have a charm of their own. I beg to differ once more with Shakespeare when he said that a rose remained as sweet by whatever name you might call it. Because I think that although a rose has some qualities of its own yet the main cause of its high position among flowers is that it has a name unparallelled in charm by any other.

The process of evolution is going on in all branches of knowledge and names are no exception that. Recently some wonderful names such as Durdana, Fouzia, Durre Samim and Durre Maknoon etc., have been developed or rather patented. These names are notable in that they have an orchestral air around them.

The late forties of this century brought in their wake along with progressive movements in art and literature, the progressive movement in names as well. Just as in the case of art and literature in the case of names also they have got the same principle 'of topsy—turvydom' being upside down with everything'. The

movement is gaining ground quite successfully though on the whole the change is gradual. Instead of an abrupt switch over the change of name takes place in several stages as if it were an organic process. A boy who enters his name as Mohammad Zahur Ahmad in the form on his admission to first year, becomes Raja Zahur Ahmad in his second year. In the third year the gentleman is known as Ahmad Zahur Raja, and when he is leaving the college for good, at the end of his sixth year he is simply Zahur Raja.

Some illustrious examples of these types of names are Ahmad Bashir, Abdulla Malik and Majid Abdul to cite only a few. I take this opportunity to point out a peculiar and perhaps singular practice in our country, that is of placing the name of one's home town at the end of the name. Some prominent examples are Hafeez Jullundhry, Shaukat Thanvi, Jigar Muradabadi and Josh Malihabadi. I wonder what might be the purpose underlying it. The only possible conclusion that can be drawn is that this might be a safety measure taken in order that if the man be lost he could be restored to his original place. Though it is a monoply of our country alone yet we will be glad to share it with other nations. We will extend a hearty welcome to names such as Milton the Londoner, Shelly the Birminghamian, Poe the Washingtonian and the like.

It wo'nt be out of place if I make bold to suggest that people must exercise extra commonsense at the time of naming their babies. It is very disgusting to know one Jamil Ahmad who is as black as a negro or to see one Zaighum Hussain who is a coward like a Jackal. I suggest that the child should be finally named at the age of ten.

By that age the skin becomes seasoned and habits established, and we can have an ample idea of the child's physiognomic tendencies.

We can thus avoid the blunder of naming a boy as Sharif Ahmad who is too mischievous and another as Azam Khan who is a pigmy. For the interim period before ten a provisional name would serve the purpose of occasional reference.

In the end, it won't be irrelevant to quote here that well-known and oft-repeated anecdote of the communal riots of the Punjab.

By the way one man asked another "Your name sir?" And no sooner did he murmur his name than the first man stabbed him to death.

And yet—what is in a name!